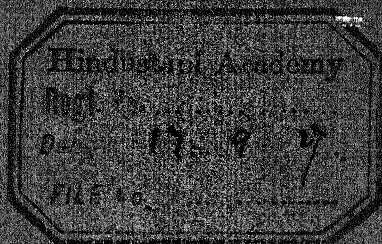


فہرستِ مضامین

مقدمہ

جہاں سے دیکھئے یک شعر شور انگیز نکلے ہے
قیامت کا سا ہنگامہ ہے ہرجا میرے دیواں میں

میر تقی (میر) سرتاج شعرائے اُردو ہیں، اُن کا کلام اُسی ذوق و شوق سے پڑھا جائے گا، جیسے (سعدی) کا کلام فارسی زبان میں۔ اگر دنیا کے ایسے شاعروں کی ایک فہرست تیار کی جائے جن کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا تو (میر) کا نام اس فہرست میں ضرور داخل کرنا ہوگا۔ یہ اُن لوگوں میں نہیں ہیں جنھوں نے موزونی طبع کی وجہ سے، یا اپنا دل بہلانے کی خاطر، یا دوسروں سے تحسین سننے کے لئے شعر کہے ہیں، بلکہ یہ اُن لوگوں میں سے ہیں جو ہمہ تن شعر میں ڈوبے ہوے تھے اور جنھوں نے اپنے کمال سے اُردو کی فصاحت کو چمکایا اور زبان کو زندہ رکھا۔ شاعری میر صاحب کی زندگی کا جز تھی گویا فطرت نے اُنھیں اِسی سانچے میں ڈھالا تھا۔ اُن کا احسان اُردو زبان پر تا قیامت قائم رہے گا اور اُن کے کلام کا لطف کسی زمانے میں کم نہ ہوگا، کیوں کہ اس میں وہ عالم گیر حسن ہے جو کسی خاص وقت یا مقام سے مخصوص نہیں۔

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز
تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

میر صاحب جیسا کہ خود اُنھوں نے اپنے تذکرے "نکات الشعرا" میں لکھا ہے: "متوطن اکبر آباد است، بہ سبب گردش لیل و نہار از چندے در شاہجہاں آباد است"۔ علی ابراہیم کے تذکرۂ گلزار ابراہیم

میں جس کا ترجمہ میرزا علی (لطف) نے (گلشن هند) کے نام سے، مسٹر جان گلکرسٹ کی فرمایش سے، (سنہ ۱۸۰۱ع سنہ ۱۲۲۵ ھ اُردو میں کیا، یہ لکھا ھے کہ "میر تخلص، نام نامی اُس نگین خاتم سخن آفرینی کا میر محمد تقی ھے متوطن اکبر آباد کے۔ سراج الدین علی خاں (آرزو) تخلص، آپ کے کچھہ رشتہ داروں میں دور کے تھے ابتدائے سن شعور سے پرورش اُنھوں نے دارالخلافہ شاھجہاں آباد میں پائی ھے اور خان مذکور کی صحبت سے نظم ریختہ کی کیفیت، باریکیوں کے ساتھہ اُٹھائی ھے"۔ غرض یہ کہ اگرچہ میر صاحب اکبر آباد میں پیدا ھوے اور اُن کے بچپن کا زمانہ بھی وھیں گزا، لیکن بعد میں وہ دلی میں چلے آے اور دلی ھی کو اپنا وطن بنا لیا۔ حقیقت یہ ھے کہ اُن کو دلی سے نہیں بلکہ دلی کو اُن کے توطن سے فخر ھے۔ پھر وہ دلی ھی کے ھو گئے اور دلی ھی کے کہلاے اور اُن کی زبان بھی، جو اُس زمانے میں مایۂ افتخار اور شرافت کی ایک علامت سمجھی جاتی تھی، دلی ھی کی تھی۔

میر صاحب کے بزرگ اپنے قبیلے کے ساتھہ حجاز سے سرحد دکن میں پہنچے اور وھاں سے احمد آباد گجرات میں وارد ھوے۔ مگر اُن کے جدّ کلاں نے اکبر آباد میں توطن اختیار کیا۔ میر صاحب کے والد میر علی متقی ایک متوکل گوشہ نشین درویش تھے اور ادنی اعلی سب اُن کی بڑی عزت کرتے تھے۔ معلوم ھوتا ھے کہ انھوں نے دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی بیوی سراج الدین علی خاں آرزو کی بہن تھیں۔ دوسری بیوی کے بطن سے میر صاحب (میر تقی) تھے۔ اولاد دونوں بیویوں سے ھوئی۔ اِس رشتے سے سراج الدین علی خاں آرزو میر صاحب کے ماموں ھوے۔ اگرچہ تذکرۂ گلزار ابراھیمی (گلشن ھند) نیز دوسرے تذکروں میں اور خود میر صاحب نے اپنے تذکرۂ شعراے اُردو میں خان آرزو کو اپنا اُستاد اور پیر مرشد لکھا ھے،

لیکن حقیقت حال ذکر میر* سے معلوم ہوتی ہے، جو یہ ہے:

میر صاحب والد کی وفات کے بعد ہی کوئی گیارہ سال کے سن میں دلی آگئے تھے اور نواب صمصام الدولہ امیرالامرا نے جو اُن کے والد سے ارادت رکھتے تھے، میر صاحب کا اپنی سرکار سے ایک روپیہ روزانہ مقرر کردیا - نواب صاحب نادر شاہ کی جنگ سنہ ۱۱۵۱ھ میں مارے گئے اور میر صاحب کا روزینہ بند ہوگیا - اِس وجہ سے اُنھیں پھر دہلی آنا پڑا - اس وقت اُن کی عمر کوئی پندرہ برس ہوگی - لکھتے ہیں کہ: " جو لوگ درویش (والد) کی زندگی میں میری خاک پا کو سرمہ سمجھ کر آنکھوں میں لگاتے تھے، اب اُنھوں نے یکبارگی مجھ سے آنکھیں چرالیں - نا چار پھر دہلی گیا اور اپنے بڑے بھائی کے ماموں سراج الدین علی خاں آرزو کا منت پذیر ہوا - یعنی کچھ دن اُن کے پاس رہا اور شہر کے بعض صاحبوں سے چند کتابیں پڑھیں - جب میں کسی قابل ہوا تو بھائی صاحب کا خط پہنچا کہ میر محمد تقی فتنۂ روز گار ہے، ہرگز اُس کی تربیت میں سعی نہ کی جائے - وہ عزیز (سراج الدین علی خاں) واقعی دنیادار شخص تھا، اپنے بھانجے کے لکھنے پر میرے در پے ہوگیا - جب کبھی ملاقات ہوتی تو بلا وجہ برا بھلا کہنا شروع کر دیتے اور طرح طرح سے تکلیف پہنچانے کی کوشش کرتے - میرے ساتھ اُن کا سلوک ایسا تھا جیسے کسی دشمن سے ہوتا ہے - فرماتے ہیں کہ "اگر اُن کی دشمنی کی تفصیل کروں تو ایک دفتر ہوجائے" - غرض اِس سے میر صاحب کو اس قدر رنج اور تکلیف ہوئی کہ وہ دروازہ بند کئے پڑے رہتے تھے اور اس رنج و غم میں اُن کی حالت جنون کی سی ہو گئی تھی -

---

* یہ کتاب میر صاحب نے اپنے حالات میں لکھی ہے - اسپر مفصل تبصرہ گزشتہ اپریل کے رسالۂ اردو میں ہوچکا ہے - اب یہ کتاب انجمن کی طرف سے شایع کی گئی ہے -

اس بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب اور خان آرزو کے تعلقات بے حد ناگوار اور تلخ تھے اُن کی تربیت اور شاگردی کی روایت فسانے سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "نکات الشعرا" "ذکر میر" سے بہت بعد لکھی گئی ہے۔ "ذکر میر" لکھتے وقت وہ تمام حالات تازہ تھے، دل پر صدمہ اور عالم پریشانی کا تھا، جو کچھ گزرا تھا من و عن سب لکھ ڈالا۔ بعد میں جب ایک مدت گزر گئی، پریشان حالی بھی رفع ہو گئی تو اِس صدمے کا اثر بھی خود بخود کم ہو گیا ایسی حالت میں اُن ناگوار واقعات کا دھرانا مناسب نہ سمجھا اور خوش اسلوبی سے اُن پر پردہ ڈال دیا۔ میر صاحب اپنی تعلیم اور شعر گوئی کی ابتدا کے متعلق خود تحریر فرماتے ہیں کہ " میر جعفر نامی ایک صاحب سے اتفاقاً ملاقات ہو گئی اور اُنھوں نے بڑی عنایت اور دل سوزی سے مجھے پڑھانا شروع کیا۔ اچانک ایک روز اُن کے وطن عظیم آباد سے خط آیا اور وہ اُدھر چلے گئے۔ کچھ دنوں بعد سعادت علی سے جو امروھے کے سید تھے، ملاقات ہو گئی۔ اُنھوں نے مجھے ریختے میں شعر موزوں کرنے کی ترغیب دی۔ میںنے جان توڑ کے محنت کی اور ایسی مشق بہم پہنچائی کہ میں شہر کے موزوں گویوں میں مستند سمجھا جانے لگا اور میرے شعر سارے شہر میں مشہور ہوگئے اور چھوٹے بڑے سب شوق سے پڑھتے تھے۔ ممکن ہے کہ میر صاحب نے خان آرزو کی صحبت سے بھی کچھ فیض پایا ہو، مگر اُن کے اور خان آرزو کے ذوق میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ میر صاحب فطرتی طور پر شاعر واقع ہوئے تھے اور ذوق شعر اُن کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا، وہ کسی کی صحبت یا شاگردي سے بالکل مستغنی معلوم ہوتے ہیں۔—

میر صاحب اس زمانے میں بہت پریشان رہے۔ کچھ دن رعایت خاں (عظیم اللہ خاں کے بیٹے) اور اعتماد الدولہ قمرالدین

خاں کے نواسے) کی مصاحبت اور رفاقت میں گذری - اس کے
بعد نواب بہادر کی سرکار سے تعلق ہو گیا - نواب بہادر
محمد شاہ بادشاہ کا خواجہ سرا تھا اور بادشاہ کی وفات کے
بعد احمد شاہ کے زمانے میں سلطنت میں اسے بڑا دخل ہوگیا
تھا - جب نواب بہادر دغا سے قتل کر دیے گئے تو میر صاحب
بھی بے کار ہوگئے - اس کے بعد وزیر کے دیوان مہانراین نے
بڑے اشتیاق سے بلا بھیجا اور اُس وقت سے اُن کی سرکار کے
متوسل ہوگئے، مگر چند ہی ماہ میں یہاں کا رنگ بدل گیا -
چند روز گوشہ نشین رہنا پڑا - دو تین ماہ بعد راجہ جگل کشور
جو محمد شاہ کے عہد میں دیوان بنگالہ تھے، میر صاحب کو
گھر سے اُٹھاکر لے گئے - جب راجۂ مذکور بھی زمانے کے ہاتھوں
لاچار ہوگئے، تو اُنھوں نے اپنی عنایت سے میر صاحب کی
تقریب راجہ ناگر مل سے کرادی جو اُس وقت نائب وزیر اور
عمدۃالملک اور مہاراجہ کے خطاب سے ممتاز تھے - یہ تمام امرا
میر صاحب سے بڑی مہربانی اور عنایت سے پیش آتے اور اُن کی
بڑی عزت و حرمت کرتے تھے - راجہ ناگرمل کی رفاقت میں
میر صاحب بہت دنوں تک رہے، اکثر مقامات میں راجہ کے
ساتھ جانا پڑا اور بعض معرکے بھی دیکھے اور راجہ کی بدولت
دوبار اکبرآباد کی زیارت بھی نصیب ہوئی - لیکن ایک ایسا
واقعہ پیش آگیا کہ میر صاحب کو راجہ کی رفاقت چھوڑنی پڑی -
جس زمانے میں جاٹوں نے بڑا فساد مچا رکھا تھا، راجہ بھی
پریشان تھے - اس نے میر صاحب کو شاہی کیمپ میں جو اُس
وقت فرخ آباد میں سایہ فگن تھا، حسام الدین کے پاس بھیجا،
جسے بادشاہ کے مزاج میں بہت دخل تھا - میر صاحب گئے اور
تمام عہد و پیماں کئے - لیکن یہاں راجہ کا چھوٹا بیٹا میرصاحب
سے خوش نہ تھا، اس لئے کہ اُن سے راجہ کے بڑے بیٹے سے بہت
ربط ضبط تھا - اُس نے برخلاف باپ کو یہ سمجھایا کہ دکھنیوں
کے پاس جانا بہتر ہے - چنانچہ راجہ بادشاہ کے لشکر میں

نہ گئے اور شہر کی طرف روانہ ہوگئے - اِس میں میر صاحب کی بہت سبکی ہوئی، وہ دہلی پہنچ کر راجہ سے علیحدہ ہوگئے —

اس کے بعد ہی کا زمانہ ہے جب کہ میر صاحب لکھتے ہیں:-

"فقیر اِن ایام میں خانہ نشین تھا - بادشاہ اکثر طلب فرماتے تھے مگر میں کبھی نہیں گیا - ابوالقاسم خاں پسر ابوالبرکات خاں صوبہ دار کشمیر اور عبدالاحد خاں کا (جو اس وقت بادشاہ کی ناک کا بال تھا) بھائی میرے ساتھہ بہت سلوک کرتا تھا، میں بھی کبھی کبھی اُس کی ملاقات کو جاتا تھا اور بادشاہ بھی کبھی کبھی کچھہ بھیج دیتے تھے" —

میر صاحب کی زندگی مصائب و آلام کا ایک سلسلہ تھی جس کا تار بچپن سے لےکر لکھنؤ جانے تک کبھی نہ ٹوٹا - لڑکپن ہی میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھہ گیا - سید امان اللہ جو اُن کے والد کے نہایت عزیز مرید تھے اور میر صاحب انھیں اپنی کتاب میں ہرجگہ عم بزرگوار لکھتے ہیں اور جو انھیں باپ سے کم عزیز نہ تھے، وہ پہلے ہی دنیا سے کوچ کر گئے تھے - باپ کے مرنے پر بھائی اور عزیز و اقارب نے بہت بے مروتی کی - دس گیارہ سال کے سن میں بسر اوقات کی فکر دامن گیر ہوئی - اِس سے ظاہر ہے کہ اُس وقت اُن کے دل و دماغ کی کیا کیفیت ہوگی - جب آگرہ اور اس کے گرد و نواح میں کوئی صورت نہ نکلی تو وہ نا چار دلی پہنچے —

اُس وقت کی دلی تاریخ میں خاص حیثیت رکھتی ہے - وہ ہندوستان کی جان اور سلطنت مغلیہ کی راج دھانی تھی مگر ہر طرف سے آفات کا نشانہ تھی - اُس کی حالت اُس عورت کی سی تھی جو بیوہ تو نہیں پر بیواؤں سے کہیں دکھیاری ہے - اولوالعزم تیمور اور بابر کی اولاد اُن کے مشہور آفاق تخت پر بے جان تصویر کی طرح دھری تھی - اقبال جواب دے چکا تھا، ادبار و انحطاط کے سامان ہو چکے تھے اور سیاہ رو زوال گرد و پیش منڈلا رہا تھا - بادشاہ دست نگر

اور امیر اُمرا مضمحل و پریشان تھے - سب سے اول نادر شاہ کا حملہ ہوا، حملہ کیا تھا خدا کا قہر تھا - نادر کی بے پناہ تلوار اور اُس کے سپاہیوں کی ہوس ناک غارت گری نے دلی کو ذوچ کھسوٹ کے ویران و برباد کر دیا - ابھی یہ کچھ سنبھلنے ہی پائی تھی کہ چند سال بعد احمد شاہ درانی کی چڑھائی ہوئی - پھر مرہٹوں، جاٹوں، روہیلوں نے وہ اودھم مچائی کہ رہی سہی بات بھی جاتی رہی - غرض ہر طرف خود غرضی، خانہ جنگی، طوائف الملوکی اور ابتری کا منظر نظر آتا تھا، یہ حالات میر صاحب نے اپنی آنکھوں دیکھے اور دیکھے ہی نہیں، اُن کے چرکے سہے اور ان انقلابات کی بدولت ناکام شاعر کی قسمت کی طرح ٹھوکریں کھاتے پھرے - یہ دلی کے اقبال کی شام تھی جس کی سحر اب تک طلوع نہیں ہوئی —

ایسے وقت میں، جب کہ پے در پے آفتیں نازل ہو رہی تھیں، شاعر بیچارے تو کس گنتی میں ہیں، بڑے بڑے وضعداروں اور متوکلوں کے اوسان بجا نہیں رہتے - اب تک جو با کمال دلی میں پڑے وضعداری نباہ رہے تھے، اِن حادثوں کے بعد وہ بھی نہ ٹک سکے، سوائے ایک خواجہ میر درد کے کہ اُن کے پائے استقامت میں کبھی لغزش نہ ہوئی —

دلی کے اُجڑنے کے بعد لکھنؤ آباد نظر آتا تھا - آصف الدولہ سا لکھ لٹ نواب تھا، اہل کمال کی قدر ہونے لگی، پھر جو اُٹھا وہیں کا ہورہا - سب سے پہلے نادرشاہ کی تباہی کے بعد سراج الدین علی خاں آرزو نے اُدھر کا رخ کیا - ابھی اُن کے لئے کوئی صورت نہ نکلی تھی کہ انتقال کرگئے - اس کے بعد مرزا رفیع سودا تشریف لے گئے - سودا کے انتقال کے بعد میر صاحب نے نواب آصف الدولہ کے یاد کرنے پر سنہ ۱۱۹۷ھ، م (سنہ ۱۷۸۲ ع) میں دلی سے لکھنؤ کوچ فرمایا - میر صاحب کے جاتے ہی دلی سونی ہوگئی اور میر حسن، میر سوز، جرأت سب لکھنؤ میں

جا بسے اور دلی کی رونق لکھنؤ میں آگئی—

میر صاحب نے اپنے لکھنؤ جانے کا حال اس طرح لکھا ھے۔ یہ وہ زمانہ ھے جب کہ دلی میں خانہ جنگی اور ابتری بپا ھے:-

"فقیر خانہ نشین تھا اور چاھتا تھا کہ شہر سے نکل جاے' لیکن بے سامانی کی وجہ سے معذور تھا - میری عزت و آبرو کی حفاظت کے لیے نواب وزیرالممالک آصف الدولہ بہادر آصف الملک کے دل میں خیال آیا کہ میر میرے پاس چلا آے تو اچھا ھو- میری طلبی کے لئے نواب سالار جنگ پسر اسحق خاں موتمن الدولہ' اور نواب اسحق خاں کے چھوٹے بھائی نجم الدولہ نے جو وزیر اعظم کے خالو ھوتے تھے' اُن قدیم تعلقات کی وجہ سے جو میرے ماموں سے تھے' کہا کہ اگر نواب صاحب از راہِ عنایت کچھہ زاد راہ عنایت فرمائیں تو البتہ میر صاحب آسکتے ھیں- نواب صاحب نے اجازت دی اور انھوں نے سرکار سے زاد راہ لیکر مجھے خط لکھا کہ نواب والا جناب آپ کو یاد فرماتے ھیں' جس طرح ھوسکے آپ یہاں آجائیے- میں پہلے ھی سے دل برداشتہ بیٹھا تھا' خط کے آتے ھی لکھنؤ روانہ ھوگیا- چونکہ خدا کا یہی منشا تھا' میں بے یار و مددگار' بغیر قافلے اور رھبر کے فرخ آباد کے رستے سے گزرا- وھاں کے رئیس مظفر جنگ تھے' انھوں نے ھر چند چاھا کہ کچھہ روز وھاں ٹھیر جاؤں مگر میرے دل نے قبول نہ کیا' دو ایک روز کے بعد روانہ ھوکر منزل مقصود پر پہنچ گیا- اول سالار جنگ کے ھاں گیا' خدا انھیں سلامت رکھے' بڑی عزت و توقیر سے پیش آے اور جو کچھہ مناسب تھا' بندگان عالی کی جناب میں کہلا کے بھیجا- چار پانچ روز بعد اتفاقاً نواب عالی جناب مرغوں کی لڑائی کے لیے تشریف لاے- میں بھی وھاں تھا' ملازمت حاصل کی- محض فراست سے دریافت فرمایا کہ میر تقی ھو؟ اور نہایت لطف و عنایت سے بغل گیر ھوے اور اپنے ساتھہ نشست کے مقام پر لے گئے- اپنے شعر مجھے مخاطب کرکے سنائے-

سبحان اللہ "کلام الملوک ملوک الکلام"- اس کے بعد فرط مہربانی سے مجھ سے فرمایش کی- اُس روز میں نے اپنی غزل کے صرف چند شعر عرض کئے- رخصت کے وقت نواب سالار جنگ نے کہا کہ اب میر صاحب حسب الطلب حاضر ہوئے ہیں، بندگان عالی مختار ہیں، انھیں کوئی جگہ عنایت فرمادی جائے، جب مرضی مبارک ہو، یاد فرمائیں- فرمایا کہ میں کچھ مقرر کرکے آپ کو اطلاع کردوں گا- دو تین روز بعد یاد فرمایا، حاضر ہوا اور جو قصیدہ میں نے مدح میں کہا تھا، پڑھا - سماعت فرمایا اور کمال لطف کے ساتھ اپنے ملازموں کے سلسلے میں داخل فرمایا اور ہمیشہ میرے حال پر عنایت و مہربانی فرماتے رہے"—

اب میر صاحب کی دلّی کی بود و باش کا خاتمہ ہوتا ہے اور لکھنؤ کی نئی زندگی شروع ہوتی ہے- از روے صاحب (گلزار ابراہیم) میر صاحب لکھنؤ سنہ ۱۱۹۷ ہجری میں پہنچے- اُس وقت اُن کی عمر ساٹھ برس کی تھی- باقی عمر تا دم آخر (سنہ ۱۲۲۵ ھ*) تک لکھنؤ ہی میں بسر ہوئی—

لکھنؤ آنے سے پہلے میر صاحب کی شہرت یہاں پہنچ چکی تھی، یہاں آے تو لوگوں نے اُن کے لئے آنکھیں بچھا دیں- امیر سے لیکر غریب تک اور بادشاہ سے لیکر فقیر تک نے اعزاز و قدر دانی میں سبقت کی- گویا میر صاحب کے آنے سے لکھنؤ کو بھاگ لگ گئے، شعر و سخن میں جان پڑگئی اور مشاعروں کی رونق بڑھ گئی- میر صاحب مرجع کمال بن گئے، دور دور سے لوگ اس شوق میں آتے تھے کہ میر صاحب کی زبان مبارک سے اُن کا کلام سنیں اور اپنے اپنے شہروں کو اُن کے اشعار بطور سوغات کے لے جائیں، یہ قبولیت اُردو کے کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہیں ہوئی تھی، اُس وقت سے اب تک میر صاحب کے

---

* ناسخ نے میر صاحب کا سنہ وفات اِس مصرعے سے نکالا ہے:
"واویلا مرد شہ شاعراں"

کمال کا سکہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے اور بڑے بڑے شاعروں نے اُنھیں اُستاد مانا ہے چنانچہ مرزا غالب فرماتے ہیں:—

ریختے کے تمھیں اُستاد نہیں ہو (غالب)
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی (میر) بھی تھا

ایک دوسری جگہ فرمایا ہے:-

(غالب) اپنا یہ عقیدہ ہے بقول (ناسخ)
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد (میر) نہیں

ذوق کا ایک شعر ہے:-

نہ ہوا پر نہ ہوا (میر) کا انداز نصیب
(ذوق) یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

مگر میر صاحب اپنے کمال سے خود واقف تھے اور انھیں اس پر ناز تھا - اور اس کا اظہار اُنھوں نے جا بجا اس طور سے کیا ہے کہ دوسرے کی مجال نہیں - چنانچہ چند اشعار اس مضمون کے یہاں نقل کیے جاتے ہیں:-

ریختہ خوب ہی کہتا ہے جو انصاف کرو
چاہیے اہل سخن (میر) کو اُستاد کریں

ریختہ رتبے کو پہنچایا ہوا اُس کا ہے
معتقد کون نہیں (میر) کی اُستادی کا

کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر (میر) کے
کچھ طرز ایسی بھی نہیں، ایہام بھی نہیں

جہاں سے دیکھیے یک شعر شور انگیز نکلے ہے
قیامت کا سا ہنگامہ ہے ہر جا میرے دیواں میں

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز
تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

اس فن میں کوئی بے تہ کیا ہو مرا معارض
اول تو میں سند ہوں، پھر یہ مری زباں ہے

اگرچہ گوشہ نشیں ہوں میں شاعروں میں (میر)
پہ میرے شور نے روے زمیں تمام لیا

باتیں ہماری یاد رہیں، پھر باتیں ایسی نہ سنئیے گا
پڑھتے کسی کو سنئیے گا تو دیر تلک سر دھنئیے گا

برسوں لگی ہوئی ہیں جب مہر و مہ کی آنکھیں
تب کوئی ہم سا صاحب، صاحب نظر بنے ہے

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

اس آخر شعر میں تعلی کی انتہا ہوگئی ہے - کسی دوسرے شخص کی کیا مجال ہے کہ وہ 'فرمانے' کا لفظ اپنے لئے اس طور سے لکھے، یہ میر صاحب ہی کو زیبا تھا ــ

میر صاحب کی شاعری اپنی بعض خصوصیتوں کی وجہ سے اردو زبان میں نہ صرف ممتاز حیثیت رکھتی ہے، بلکہ اپنی نظیر نہیں رکھتی - الفاظ کا صحیح استعمال اور اُن کی خاص ترتیب و ترکیب، زبان میں موسیقی پیدا کر دیتی ہے، اس کے ساتھ اگر سادگی اور پیرایۂ بیان بھی عمدہ ہو تو شعر کا رتبہ بہت بلند ہوجاتا ہے - میر صاحب کے کلام میں یہ سب خوبیاں موجود ہیں اور اِس کے ساتھ ہی اُن کا کلام ایسا درد

بھرا ھے کہ اُس کے پڑھنے سے دل پر چوٹ سی لگتی ھے' جو لطف سے خالی نہیں ھوتی - اُن کی زبان کی فصاحت اور سادگی' سوز و گداز' مضامین کی جدت اور تاثیر یہ ایسی خوبیاں ھیں جو اُردو کے کسی دوسرے شاعر میں نہیں پائی جاتیں - اُن کی شاعری عاشقانہ ھے لیکن کہیں کہیں وہ اخلاقی اور حکیمانہ مضامین کو اپنے رنگ میں ایسی سادگی ' صفائی اور خوبی سے ادا کر جاتے ھیں جس پر ھزار بلند پروازیاں اور نازک خیالیاں قربان ھیں ' یہ خاص انداز میر صاحب کا ھے - مگر اُن کا کلام حسرت و ناکامی ' حرمان و مایوسی سے بھرا ھوا ھے - اس کی ایک وجہ تو یہ ھے کہ میر صاحب بہت بڑے درویش کے بیٹے تھے ' اُن کے بچپن کا تمام زمانہ درویشوں ھی کی صحبت میں گزرا - سید امان اللہ ' جنہیں میر صاحب چچا کہتے تھے اور حقیقت یہ ھے کہ اُنھیں کی آغوش شفقت میں پرورش اور تربیت پائی ' جب کبھی کسی درویش سے ملنے جاتے تو ھمیشہ میر صاحب کو ساتھ لے جاتے اور یہ اُن کی ملاقاتوں اور صحبتوں میں حاضر رھتے - اُن کے والد کی خدمت میں بھی اکثر درویش اور دوسرے لوگ حاضر ھوتے ' یہ چپکے چپکے سب کچھ دیکھتے اور سنتے رھتے تھے - خود والد نے سید امان اللہ یا میر صاحب کو تلقین کی تو وہ بھی درویشانہ اور صوفیانہ ' اور خاصکر عشق اختیار کرنے کی تاکید فرماتے تھے " بیٹا ! عشق اختیار کرو کہ عشق ھی کا اِس کار خانے پر تسلط ھے - اگر عشق نہ ھوتا تو یہ تمام نظام درھم برھم ھوجاتا - بے عشق کے زندگانی وبال ھے اور عشق میں دل کھونا اصل کمال ھے - عشق بسازد و عشق بسوزد - عالم میں جو کچھ ھے وہ عشق ھی کا ظہور ھے .... بیٹا ! زمانہ سیّال ھے یعنی بہت کم فرصت ' اپنی تربیت سے غافل نہ رھو اس رستے میں بہت نشیب و فراز ھے ' دیکھ کر چلو .... ایسے پھول کا بلبل بنو جو سدا بہار ھو .... فرصت

کو غنیمت سمجھو اور اپنے تئیں پہچاننے کی کوشش کرو"۔ جب ان زاں یہی صدائیں کان میں پڑتی رهیں تو وہ بچہ بڑا ہو کر درویش نہیں تو درویش منش ضرور ہو کر رهیگا۔ وہ اپنے والد کے متعلق لکھتے هیں:- "جوان صالح اور عاشق پیشہ تھے، دل میں گرمی اور سوز رکھتے تھے۔ اخلاق سنجیدہ اور اوصاف حمیدہ رکھتے تھے۔ استقامت ایسی تھی کہ شاید کسی میں ہو۔ طبعش مشکل پسند، جانش درد مند، مژگاں نم حال درهم"۔ یہی اوصاف ارثاً میر صاحب کو بھی ملے۔ اس پر لڑکپن میں یتیم ہو گئے۔ ایک تو یتیمی کا صدمہ دوسرے عزیز و اقارب کی طوطا چشمی، زمانے کی بے مروتی، بے سر و سامانی، یہ ایسی حالتیں نہ تھیں کہ اُن کے دل پر اثر نہ کرتیں۔ پھر وہ ایسے زمانے میں پیدا ہوے جب کہ مسلمانوں کے اقبال کا ستارہ گہنا رہا تھا اور هر طرف مایوسی و نا کامی نظر آتی تھی اور اُن حیرت انگیز اور زهرہ گداز واقعات اور انقلابات کو دیکھا اور برتا جو چند خاندانوں اور شہروں کا نہیں ملکوں اور قوموں کا خاتمہ کر دیتے هیں۔ ممکن نہ تھا کہ میر صاحب کی سی اثر قبول طبیعت اِن حالات سے متاثر نہ ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ اگر چہ اُن کے کلام کی فصاحت و شستگی سے خاص لطف حاصل ہوتا ہے مگر پڑھنے والے کے دل پر مایوسانہ اثر پیدا کئے بغیر نہیں رهتا۔ شگفتگی اور زندہ دلی میر صاحب کی تقدیر میں نہیں تھی وہ سراپا یاس و حرماں تھے اور یہی حال اُن کے کلام کا ہے گویا اُن کا کلام اُن کی طبیعت و سیرت کی ہو بہو تصویر ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ وہ اصلیت و حقیقت سے خالی نہیں —

یہ رائے قیاسی یا فرضی نہیں۔ "ذکر میر" پڑھنے کے بعد اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ اُن کا هر شعر اُن کے درد دل کی تصویر ہے۔ غزلوں سے صرف اُن کی طبیعت کا رنگ معلوم ہوتا ہے، یہ معلوم ہونا دشوار ہے کہ کونسی غزل کس وقت

اور کس حالت میں لکھی گئی - لیکن بعض واقعات جو ضمناً آگئے ہیں، اُن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب کی شاعری کا بہت سا حصہ آپ بیتی اور اپنے دل کی کیفیت ہے - مثلاً خان آرزو کی بے مروتی اور دل آزار سلوک اور اپنی بے نوائی اور بے بسی کا اُن کے قلب پر بڑا صدمہ تھا اور وہ بہت ہی شکستہ دل اور دل گرفتہ رہتے تھے - اسی غم و غصے میں اُن پر ایک جنون کی سی حالت طاری ہوگئی اور انھیں چاند میں ایک عجیب صورت نظر آنے لگی جس سے اُن کی وحشت اور دیوانگی اور بڑھ گئی - اس حالت کو ہم اُنھیں کے الفاظ میں نقل کرتے ہیں —

"در شب ماہ پیکرے خوش صورت با کمال خوبی از جرم قمر انداز طرف من می کرد و موجب بے خودی می شد - بہر طرف کہ چشمم می اُفتاد برآں رشک پری می افتاد، بہر جا کہ نگاہ می کردم تماشاے آں غیرت حور می کردم - درو بام و صحن خانۂ من ورق تصویر شدہ بود، یعنی از حیرت افزائی از شش جہت رو می نمود - گاہے چوں ماہ چہار دہ مقابل، گاہے سیر گاہ او منزل دل - اگر نظر بر گل مہتاب می افتاد، آتشے در جان بے تاب می افتاد - ہر شب باو صحبت، ہر صبح بے او وحشت - دمے کہ سفیدۂ صبح می دمید، از دل گرم آہ سرد می کشید، یعنی آہ می کرد و انداز ماہ می کرد - تمام روز جنوں می کردم، دل در یاد او خوں می کردم - کف بر لب چوں دیوانہ و مست، پارہ ہاے سنگ در دست، من افتاں و خیزاں، مردم از من گریزاں - تا چار ماہ آں گُل شب افروز رنگ تازہ می ریخت و از فتنہ خرامی ہا قیامت می انگیخت - ناگاہ موسم گل رسید، داغ سودا سیاہ گردید، یعنی چوں پریدار شدم مطلق از کار شدم - صورت آں شکل و ہمیں در نظر، خیال مشکینش در سر - شایستۂ کنارہ گیر شدم، زندانی و زنجیری شدم" —

اب اس کے بعد میر صاحب کی مثنوی " خواب و خیال "
پڑھئے' اس قلبی واردات کی تصویر اور اِس خواب کی تعبیر
صاف نظر آتی ہے - یہ محض خواب و خیال ہی نہیں بلکہ ایک
واقعہ تھا جو اُن کے مایوس اور حزیں دل پر گزرا تھا —

یا جب جاٹوں کی سرکشی اور فتنہ پردازی سے تنگ آکر
راجہ ناگر مل بیس ہزار گھروں سمیت' جن میں زیادہ تر
اُنھیں کے وابستہ تھے' اپنا عزیز مقام چھوڑ کر کاماں جاتے ہیں
(میر صاحب بھی اس سفر میں راجہ صاحب کے ہمراہ تھے)
تو میر صاحب نے ایک مخمس لکھا ہے جس میں اپنی پریشاں
حالی اور اُس برے وقت کا رونا رویا ہے - اسی قسم کی
اور نظمیں بھی ہیں (مثلاً اپنے گھر کا حال وغیرہ) جن میں
اپنی بپتا بیان کی ہے - اگرچہ یہ وقتی حالات اور ایک شخص
واحد کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں' لیکن سچا شاعر ان کو
اس انداز اور خوبی سے بیان کر جاتا ہے کہ ہر شخص لطف
حاصل کر سکتا ہے - وہ مر جاتا ہے مگر یہ چھوٹے چھوٹے
بے حقیقت واقعات اس کے لطف بیان کی بدولت ہمیشہ کے
لئے زندہ رہ جاتے ہیں —

اُن کا کلام دور از کار استعارات' بعید از قیاس مبالغے اور
عادت امور سے پاک ہے' بھونڈے اور بے جا تکلف و تصنع اور
فضول لفاظی کا نام نہیں' وہ قلبی واردات اور کیفیات کو
نہایت سادہ' شستہ اور صاف زبان میں ایسے دلکش اسلوب
سے بیان کرتے ہیں کہ جو بات وہ کہنی چاہتے ہیں وہ دل میں
اُتر جاتی ہے - غرض یہ کہ اُن کا کلام بہ لحاظ فصاحت و روانی
سہل ممتنع ہے اور سہل ممتنع کلام کا تجزیہ کر کے الگ الگ
اُس کی خوبیوں کا گنوانا نا ممکن ہے - کیونکہ اس سے کلام
کی اصلی خوبی کا کامل اندازہ تو ہوتا نہیں البتہ اس کی
نسبت غلط فہمی پیدا کر دینے کا اندیشہ ضرور ہوتا ہے —

شاعر کے کلام کا ایک بڑا معیار اُس کلام کی تاثیر ہے اگر

اس معیار پر میر صاحب کے کلام کو جانچا جاے تو اُن کا رتبہ اُردو شعرا میں سب سے اعلیٰ پایا جاتا ھے - اُن کے اشعار سوز و گداز اور درد کی تصویریں ھیں، زبان سے نکلتے ھی دل میں جا کر بیٹھہ جاتے ھیں - میر صاحب کی عمر کوئی نوے برس کی تھی اور ان کو وفات پاے ھوے سو برس سے زیادہ ھوتے ھیں لیکن اب تک یہ حال ھے کہ لوگ اُن کے کلام کو پڑہ پڑہ کر مزے لیتے اور سر دھنتے ھیں —

میری یہ راے میر صاحب کے منتخب کلام کی نسبت ھے ورنہ اُن کی ضخیم کلیات میں رطب و یابس سب کچھہ بھرا پڑا ھے - مولانا (آزردہ *) نے اُن کے کلام کی نسبت اپنے تذکرے میں صحیح لکھا ھے کہ "پستش بغایت پست و بلندش بغایت بلند است" - اس پر مولانا حالی کی عام راے کا نقل کر دینا جو اُنھوں نے شعرا کی نسبت لکھی ھے، لطف سے خالی نہ ھو گا —

"یہ بات یاد رکھنی چاھئے کہ دنیا میں جتنے شاعر اُستاد مانے گئے ھیں یا جن کو اُستاد ماننا چاھئے، اُن میں ایک بھی ایسا نہ نکلے گا جس کا تمام کلام اول سے آخر تک حسن و لطافت کے اعلیٰ درجے پر واقع ھوا ھو کیونکہ یہ خاصیت صرف خدا ھی کے کلام میں ھو سکتی ھے - شاعر کی معراج کمال یہ ھے کہ اُس کا عام کلام ھموار اور اصول کے موافق ھو اور کہیں کہیں اس میں ایسا حیرت انگیز جلوہ نظر آے جس سے شاعر کا کمال خاص و عام کے دلوں پر نقش ھو جاے البتہ اتنی بات ھے کہ اُس کے عام اشعار بھی خاص خاص اشخاص کے دل پر خاص خاص حالتوں میں تقریباً ویسا ھی اثر کریں جیسا کہ اُس کا خاص کلام ھر شخص کے دل پر ھر حالت میں اثر کرتا ھے اور یہ بات اُسی شاعر کے کلام میں پائی جا سکتی ھے جس کا کلام سادہ اور نیچرل ھو —

---

* مقدمہ شعر و شاعری از مولانا حالی صفحہ ۸۲ طبع دھلی-

میر صاحب کے کلام میں ایسے حیرت انگیز جلوے اکثر نظر آتے ہیں - جس طرح بعض اوقات سمندر کی سطح دیکھنے میں معمولی اور بے شور و شر نظر آتی ہے لیکن اُس کے نیچے ہزاروں لہریں موج زن ہوتی اور ایک کھلبلی مچائے رکھتی ہیں اسی طرح اگرچہ میر صاحب کے اشعار کے الفاظ ملائم، دھیمے، سلیس اور سادہ ہوتے ہیں لیکن ان کی تہ میں غضب کا جوش یا درد چھپا ہوتا ہے - الفاظ کی سلاست اور ترکیب کی سادگی لوگوں کو اکثر دھوکا دیتی ہے وہ اُن پر سے بے خبر گزر جاتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ شاعر نے ان سلیس الفاظ اور معمولی ترکیب میں کیا کیا کہاں بھر رکھے ہیں - میر صاحب کا کلام اس بارے میں اپنا جواب نہیں رکھتا اور غور سے پڑھنے کے قابل ہے - بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ پڑھنے والے قدیم الفاظ یا محاورے یا متروک ترکیب کو دیکھکر شعر چھوڑ دیتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ اسی لفظ یا ترکیب نے جسے وہ متروک سمجھتے ہیں خاص لطف پیدا کر دیا ہے یا کم سے کم وہ شعر کے حسن میں حارج نہیں —

میں یہاں چند شعر مثال کے طور پر نقل کرتا ہوں جس سے اُن کے کلام کی حسن و خوبی اور ان کے خاص انداز کا اندازہ ہو سکتا ہے —

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا
دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

ہم خاک میں ملے تو ملے لیکن اے سپہر
اُس شوخ کو بھی راہ پہ لانا ضرور تھا

یاد اس کی اتنی خوب نہیں (میر) باز آ
نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جاے گا

جو اس شور سے (میر) روتا رہے گا
تو ہمسایہ کا ہے کو سوتا رہے گا

اُلٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھہ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اِس بیماری دل نے آخر کام کیا
عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے، صبح ہوئی آرام کیا
ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بد نام کیا
یاں کے سفید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا اور دن کو جوں توں شام کیا

گُل کی جفا بھی دیکھی، دیکھی وفاے بلبل
اک مشت پر پڑے تھے گُلشن میں جاے بلبل

کیونکر گلی سے اُس کی اُٹھہ کر میں چلا جاتا
یاں خاک میں ملنا تھا، لوہو میں نہانا تھا
کہتا تھا کسو سے کچھہ، تکتا تھا کسو کا منہ
کل (میر) کھڑا تھا یاں، سچ ہے کہ دِوانا تھا

جفائیں دیکھہ لیاں بیوفائیاں دیکھیں
بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں

ہوگا کسی دیوار کے سائے کے تلے (میر)
کیا کام محبت سے اُس آرام طلب کو

اِک شخص مجھی سا تھا کہ تھا تجھ سے پہ عاشق
وہ اُس کی وفا پیشگی، وہ اُس کی جوانی
یہ کہہ کے میں رویا تو لگا کہنے نہ کہہ (میر)
سنتا نہیں میں ظلم رسیدوں کی کہانی

جب کوندتی ہے بجلی تب جانب گلستاں
رکھتی ہے چھیڑ میرے خاشاک آشیاں سے
خاموشی ہی میں ہم نے دیکھی ہے مصلحت اب
ہر اک سے حال دل کا مدت کہا زباں سے

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے
اس طرح کے جینے کو کہاں سے جگر آوے

متصل روتے ہی رہئے تو بجھے آتش دل
ایک دو آنسو تو اور آگ لگا جاتے ہیں

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

عشق ہمارے خیال پڑا ہے خواب گیا آرام گیا
دل کا جانا ٹھہر گیا ہے صبح گیا یا شام گیا

جی ہی دانے کا نہیں کڑھنا فقط
اُس کے در سے جانے کی حسرت بھی ہے

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھہ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

اس آخری شعر پر مولانا حالی نے اپنے مقدمۂ دیوان میں ایک بہت ہی پر لطف لطیفہ لکھا ہے جس سے نہ صرف اس شعر کی خوبی بلکہ میر صاحب کے کلام کی خصوصیت کا پورا اندازہ ہوتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ "مولانا آزردہ کے مکان پر اُن کے چند احباب، جن میں مومن اور شیفتہ بھی تھے ایک روز جمع تھے؛ میر کا یہ شعر پڑھا گیا۔ شعر کی بے انتہا تعریف ہوئی اور سب کو یہ خیال ہوا کہ اس قافیے کو ہر شخص اپنے اپنے سلیقے اور فکر کے موافق باندھ کر دکھاے۔ سب قلم دوات اور کاغذ لیکر الگ الگ بیٹھہ گئے اور فکر کرنے لگے اُسی وقت ایک اور دوست وارد ہوے، مولانا سے پوچھا کہ حضرت کس فکر میں بیٹھے ہیں؟ مولانا نے کہا "قل ھو اللہ کا جواب لکھہ رہا ہوں"—

مولانا حالی نے اسی شعر کے متعلق یہ راے ظاہر کی ہے۔

"ظاہر ہے کہ جوش جنوں میں گریبان یا دامن یا دونوں کو چاک کرنا ایک نہایت مبتذل اور پامال مضمون ہے جس کو قدیم زمانے سے لوگ برابر باندھتے چلے آئے ہیں، ایسے چتھیڑے ہوے مضمون کو میر نے باوجود غایت درجے کی سادگی کے ایک ایسے اچھوتے نرالے اور دلکش اسلوب میں بیان کیا ہے کہ اس سے بہتر اسلوب تصور میں نہیں آسکتا۔ اس اسلوب میں بڑی خوبی یہی ہے کہ سیدھا سادہ ہے، نیچرل ہے اور باوجود اُس کے بالکل انوکھا ہے"—

یہی خوبی میر کے تمام منتخب کلام میں پائی جاتی ہے، چنانچہ چند اشعار جو نمونے کے طور پر اوپر لکھے گئے ہیں اُن کے پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ زبان کی سلاست وفصاحت کے ساتھہ پیرایۂ بیان کس قدر دلکش نرالا اور پر تاثیر ہے

یوں تو میرصاحب کے تمام نامور ہمعصروں کے کلام میں سادگی، صفائی اور روزمرے کی پابندی پائی جاتی ہے لیکن محض سلاست اور زبان کی فصاحت کام نہیں آسکتی جب تک کہ بیان میں تازگی، اداے مطلب میں شگفتگی اور خیال میں بلندی و جدت نہ ہو - میر صاحب کے کلام میں یہ سب خوبیاں ایک جا جمع ہیں اور پھر اس پر درد اور تاثیر خداداد معلوم ہوتی ہے - اسی وجہ سے وہ اپنے تمام ہمعصروں میں ممتاز اور اُردو شاعروں میں خاص درجہ رکھتے ہیں اور اُن کی اس ممتاز خصوصیت کو اب تک کوئی نہیں پہنچا ہے - البتہ خواجہ میر درد ایک ایسے شاعر ہیں جنھوں نے سلاست و فصاحت زبان کے ساتھہ اخلاقی مضامین اور صوفیانہ خیالات کی چاشنی دی ہے اور کلام میں درد پیدا کیا ہے، بیان میں جدت اور تازگی بھی پائی جاتی ہے جس سے وہ میر صاحب کے لگ بھگ پہنچ جاتے ہیں لیکن بیان میں وہ گھلاوٹ نہیں جو میر صاحب کے ہاں ہے اور نہ غایت درجہ سلاست و سادگی کے ساتھہ وہ سوز و گداز ہے اور نہ تخیل کی وہ شان ہے جو شاعری کی جان ہے، خصوصاً بیان کا وہ انوکھا انداز جس میں ایک خاص نزاکت ہوتی ہے نظر نہیں آتا - میر صاحب کا بڑا کمال اسی میں ہے - میر انیس) بھی جن کا فصاحت میں بہت بلند درجہ ہے اور جو سوز و غم کے بیان میں اپنی نظیر نہیں رکھتے، میر صاحب کو نہیں پہنچتے - میر انیس میں پھر بھی تصنع اور تکلف آجاتا ہے، میر اس سے بالکل بری ہے - وہ خود سوز و غم کا پتلا ہے اور اُس کا شعر سوز و غم کی صحیح اور سچی تصویر ہے جس میں تکلف کا نام نہیں - میر انیس کے ہاں خیال کے مقابلے میں الفاظ کی بہتات ہے اور خیال سے پہلے لفظ پر نظر پڑتی ہے، لیکن میر کے اشعار میں الفاظ خیال کے ساتھہ اِس طرح لپٹے ہوئے ہیں کہ پڑھنے والا محو ہوجاتا ہے اور اُسے لفظ خیال سے الگ نظر نہیں آتا - میر

انیس کے ہاں دھوم دھام اور بلند آہنگی ہے ' میر کے ہاں سکون اور خاموشی ہے اور اس کے شعر چپکے چپکے خود بخود دل میں اثر کرتے چلے جاتے ہیں' جس کی مثال اُس نشتر کی سی ہے جس کی دھار نہایت باریک اور تیز ہے اور اُس کا اثر اُسی وقت معلوم ہوتا ہے جب وہ دل پر جاکر کھٹکتا ہے - میر انیس رلاتے ہیں' میر خود روتا ہے - یہ آپ بیتی ہے اور وہ جگ بیتی —

میر کے کلام کی جن خصوصیتوں کا ذکر ہوا ہے وہ مثال سے پوری طرح واضح ہوجائیں گی - جو اشعار نمونے کے طور پر اوپر لکھے گئے ہیں اُن میں کا ایک شعر یہ ہے :—

ہوگا کسی دیوار کے سائے کے تلے (میر)
کیا کام محبت سے اُس آرام طلب کو

اس شعر کا حسن شرح و بیان سے باہر ہے ' آرام طلب کا لفظ اُس کی جان ہے - اس لفظ کو نظر میں رکھئے اور پھر اس شعر کو غور سے ملاحظہ کیجئے تو شعر کا اصلی لطف سمجھ میں آئیگا - ایک شخص جو محبت کے کارن عیش و آرام پر لات مار کے اور گھر بار چھوڑ کر' بے یار و بے خانماں' آوارہ و سر گرداں ' محبوب کی دیوار کے نیچے پڑا ہے ' اُسے طعنہ دیا جاتا ہے کہ آرام طلب ہے اور ایسے آرام طلب کو محبت سے کیا کام؛ جب یہ آرام طلبی ہے تو قیاس کرنا چاھئے کہ محبت کی مصیبت کیا ہوگی اور شاعر عاشق سے کیا توقع رکھتا ہے ؟ ایک دوسری مثال لیجئے :—

ایک شخص مجھی سا تھا کہ تھا' تجھسے پہ عاشق
وہ اُس کی وفا پیشگی وہ اُس کی جوانی!

یہ کہہ کے میں رویا تو لگا کہنے نہ کہہ میر
سنتا نہیں میں ظلم رسیدوں کی کہانی

اس میں کوئی اعلیٰ درجے کا مضمون یا کوئی مبالغہ یا استعارہ و تشبیہ یا کسی قسم کی صنعت نہیں مگر اظہار

مطلب کے لئے کیسا خوبصورت پیرایہ اختیار کیا گیا ہے اس قسم کے اظہار حال میں سخت مشکل پیش آتی ہے - اور انسان ہزار کوشش کرے اور کیسا ہی پہلو کیوں نہ اختیار کرے پھوہڑپنے سے بچ نہیں سکتا - شاعر نے اس بد تہذیبی سے بچنے کے لئے پردے ہی پردے میں نہایت خوش اسلوبی کے ساتھہ دردِدل کی کیفیت کا اظہار کیا ہے اور اس پیرائے سے جو اثر پیدا ہو سکتا ہے وہ کبھی صاف صاف اپنے حال کے بیان کرنے سے نہیں ہو سکتا اور پھر لطف یہ ہے کہ اِس میں کہیں معشوق کی جفایا بے وفائی کا ذکر نہیں صرف عاشق کی جوانی اور اُس کے حالِ زار کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور یہ کہہ کے اُس کا رونے لگنا، اُس کے درد دل کو آشکارا کر دیتا ہے اور یہاں پردہ خود بخود اُٹھہ جاتا ہے - یہ پیرایہ غضب کا درد انگیز ہے اور پھر معشوق کے جواب نے اِس درد میں ہزاروں ٹیسیں پیدا کر دی ہیں - یہ میر صاحب کا خاص کمال ہے اور یہی چیز ہے جو اُن کی شاعری کو ہمیشہ زندہ رکھے گی —

سرھانے میر کے آہستہ بولو
ابھی تک روتے روتے سو گیا ہے

یہ شعر کس قدر سادہ ہے - اس سے زیادہ آسان، عام اور معمولی الفاظ اور کیا ہوں گے؛ لیکن اندازِ بیان درد سے لبریز ہے اور لفظ لفظ سے حسرت و یاس ٹپکتی ہے - اُردو کیا، مشکل سے کسی زبان میں اس پایے کا اور ایسا درد انگیز شعر ملے گا - ایک دوسری بات اِس شعر میں قابلِ غور یہ ہے کہ: جو شخص دوسروں کو غل نہ کرنے اور آہستہ بولنے کی ہدایت کر رہا ہے وہ بھی بیمار کے پاس بیٹھا ہے اور اُس پر بھی لازم ہے کہ یہ بات آہستہ سے کہے - اس کے لئے یہ ضرور ہے کہ لفظ ایسے چھوٹے، سلیس اور دھیمے ہوں کہ دھیمی سی دھیمی آواز میں بھی ادا ہو سکیں - اب اس شعر کو دیکھئے کہ لفظ تو کیا ایک حرف بھی ایسا نہیں جو کرخت ہو یا ہونٹوں کے ذرا سے

اشارے سے بھی ادا نہ ہو سکتا ہو —

جو اس شور سے میر روتا رہے گا
تو ہمسایہ کا ہے کو سوتا رہے گا

اس میں کوئی خاص مضمون یا بات نہیں مگر شعر کس قدر پر درد ہے، دوسرے مصرعے نے اسے نہایت درد انگیز بنا دیا ہے - یہ سلاست اور یہ انداز بیان اور اس میں یہ درد میر صاحب کا حصہ ہے - ان اشعار کے سامنے صنائع و بدائع، تکلف و مضمون آفرینی، فارسی و عربی ترکیبیں کچھہ حقیقت نہیں رکھتیں —

مقدور بھر تو ضبط کروں ہوں پہ کیا کروں
منہ سے نکل ہی جاتی ہے اک بات پیار کی

یہ شعر میر کے اعلیٰ یا منتخب اشعار میں سے نہیں ہے ایک معمولی شعر ہے، لیکن دل کی ایک فطری کیفیت کو کس خوبی سے بیان کیا ہے اور جیسا یہ خیال فطرتی اور سادہ ہے ویسے ہی الفاظ بھی سادہ اور بندش اور ترکیب بھی صاف اور ستھری ہے مگر انداز بیان کا حسن یہاں بھی وہی ہے —

ایسے اشعار میر کے کلام میں سینکڑوں ملیں گے، اس لئے یہاں اور اشعار کا مثال کے طور پر لکھنا مضمون کو طول دینا ہے —

میر صاحب کے کلام میں اخلاقی اور حکیمانہ اشعار کی بھی کچھہ کمی نہیں، لیکن اخلاق ہو یا حکمت، اندرونی کیفیت ہو یا بیرونی حالت، انداز بیان وہی ہے - نہایت معمولی اور سادہ الفاظ میں بڑے بڑے نکات اور بلند مضامین اس بے تکلفی سے بیان کر جاتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے - بلکہ بعض اوقات سرسری طور پر پڑھنے سے خیال نہیں گزرتا کہ اِن سادہ الفاظ اور سلیس ترکیبوں کے پردے میں ایسے ایسے بلند خیالات پنہاں ہیں!

مثال کے طور پر یہاں چند شعر لکھے جاتے ہیں :

سرسری تم جہان سے گزرے
ورنہ ہر جا جہان دیگر تھا

(کس قدر بلند اور اعلیٰ مضمون ہے مگر کس خوبی اور آسانی سے ادا کیا گیا ہے)

کل پانؤں ایک کاسۂ سر پر جو آگیا
یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ: دیکھہ کے چل راہ بے خبر!
میں بھی کبھو کسو کا سر پر غرور تھا

وصل و ھجراں سے جو دو منزل ہیں راہ عشق کی
دل غریب اِن میں خدا جانے کہاں مارا گیا

ہم نہ کہتے تھے کہ مت دیر و حرم کی راہ چل
اب یہ دعویٰ حشر تک شیخ و برھمن میں رہا

یہ بھی طرفہ ماجرا ہے کہ اُسی کو چاھتا ھوں
مجھے چاھئے ہے جس سے بہت احتراز کرنا

اوپر کے ان تینوں شعروں میں انسان کی حالت کا کس قدر سچا نقشہ کھینچا ہے —

بارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھہ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

کہا میں نے: "کتنا ہے گل کا ثبات"
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

بیان کی یہ نزاکت قابل غور ہے:

ہر دم قدم کو اپنے رکھہ احتیاط سے یاں
یہ کارگاہ ساری دوکان شیشہ گر ہے

اُڑنے کی یک ہوس ہے ہم کو قفس سے ورنہ
شائستۂ پریدن بازو میں پر کہاں ہے

ملک کی موجودہ سیاسی حالت پر یہ شعر کس قدر صادق آتا ہے:—

اب پست و بلند ایک ہے جوں نقش قدم یاں
پامال ہوا خوب تو ہموار ہوا میں

الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنہیں ہے بندگی خواہش
ہمیں تو شرم دامنگیر ہوتی ہے خدا ہوتے

میر صاحب کا کلام عاشقانہ ہے لیکن ان میں اکثر اشعار ایسے ملیں گے جن میں کوئی اخلاقی یا حکیمانہ نکتہ نہایت خوش اسلوبی سے بیان کیا گیا ہے - انسان کی طبیعت کے دو رنگ ہیں: لطف و مسرت یا اندوہ والم، میر صاحب کے اشعار عاشقانہ ہوں یا حکیمانہ اِن میں اندوہ و الم، ناکامی و مایوسی کی جھلک پائی جاتی ہے، یہ اُن کی طبیعت کی اُفتاد ہے، وہ کسی حال میں ہوں، کوئی کیفیت اُن پر طاری ہو، اُن کے دل سے جب کوئی بات نکلی وہ یاس و ناکامی میں ڈوبی ہوئی تھی - ظرافت کی چاشنی میر صاحب کے کلام میں مطلق نہیں مگر نہ معلوم کیا اتفاق ہوتا تھا اور وہ کیسی سبھہ گھڑی ہوتی تھی کہ جب اُن کے افسردہ اور حرماں نصیب دل کی کلی کھلتی اور وہ ایک آدہ شعر اس قسم کا بھی کہہ جاتے - اُن کے کلام میں چند ظریفانہ اشعار بھی پائے جاتے ہیں لیکن یا تو وہ ایسے مبتذل قسم کے ہیں کہ اُن سے بد مذاقی پائی جاتی ہے یا وہی حسرت ویاس جواُن کے دم کے ساتھہ تھی - حیرت ہے کہ ظرافت کے وقت بھی یہ رنگ نہ گیا چنانچہ فرماتے ہیں:—

تھا (میر) بھی دیوانہ، پر ساتھہ ظرافت کے
ہم سلسلہ داروں کی زنجیر ہلا جاتا

میر صاحب نے چند قصیدے بھی لکھے ھیں اگرچہ اس میں بھی وہ بند نہیں اور ترکیب و خیال میں بلندی پائی جاتی ھے مگر حقیقت یہ ھے کہ وہ اس گوں کے نہیں تھے اور قصیدہ لکھنا اُن کی طبیعت کی اُفتاد کے خلاف تھا جس کی وجہ ھم آگے چل کر بیان کریں گے اور یہی وجہ ھے کہ اُن کے قصیدے دو چار سے زیادہ نہیں —

البتہ مثنویاں قابل ذکر ھیں - یوں تو چودہ پندرہ مثنویاں ھیں لیکن بعض اِن میں ایسی ھیں کہ اب بھی اُن کا پڑھنا لطف سے خالی نہیں، مثلاً دو مثنویاں جو اپنے گھر کی خرابی اور برسات کی شکایت میں لکھی ھیں، خوب ھیں - برسات میں اس مصیبت کا حال بہت ھی درد ناک ھے؛ صحیح اور سچی واردات جو ایسی حالت میں واقع ھوتی ھے؛ اس طرح لکھی ھے کہ آنکھوں کے سامنے بے سر و سامانی کا نقشہ کھنچ جاتا ھے اور غربا پر جو اس موسم میں گزرتی ھے اُس کی حقیقی تصویر اس سے بہتر کہیں نہیں ملتی - اس سے میر صاحب کی قوت مشاھدہ اور بیان واقعہ کی قدرت ظاھر ھوتی ھے - عشقیہ مثنویوں میں قصے اور بیان کے لحاظ سے سب سے بہتر (شعلۂ عشق) ھے - یہ ایک سادہ اور مختصر سا قصہ ھے، لیکن جس طرح اُنھوں نے اُسے اُٹھایا ھے اور آخر تک نبھایا ھے، وہ بہت قابل تعریف ھے - یہ پرس رام کی بیوی کی درد ناک کہانی ھے - سارے قصے پر یاس و الم کا سایا سا پڑا ھوا نظر آتا ھے - اول ابتدا ھی پر درد انجام کا پتا دیتی ھے - جن اشخاص کا اس میں ذکر آیا ھے، اُن کی ساری حالت حقیقی رنگ میں دکھائی ھے - قصے کی دلچسپی اس میں نہیں کہ کس کس نے کیا کیا کیا بلکہ اسی راز میں ھے کہ ھونی اَن ھونی نہیں ھو سکتی - مثنوی میں ھر چیز انسانی زندگی سے کامل طور پر مطابق ھے، سوائے انجام کے جسے تخیل کی پرواز حقیقی سے خیالی زندگی میں اُڑا لے گئی ھے —

دوسری عشقیہ مثنوی (دریائے عشق) ہے - یہ بھی ایک معمولی قصہ ہے - اِن دونوں مثنویوں میں بیان سادہ اور بے تکلف اور مسلسل ہے - کہیں کہیں فارسی ترکیبیں آجاتی ہیں ورنہ زبان بہت صاف ستھری ہے اور میر صاحب کا اصلی رنگ صاف نظر آتا ہے —

سب سے بڑی مثنوی "شکار نامہ" کی ہے جس میں نواب آصف الدولہ کے شکار کا حال ہے اس میں جا بجا غزلیں آتی ہیں جن کے متعلق کچھ کہنے کی حاجت نہیں - اس میں میر صاحب کو خاص کمال حاصل ہے لیکن صفائی بیان و زبان میں یہ اُدھر کی دو مثنویوں کو نہیں پہونچتی - اس میں فارسیت کا رنگ غالب ہے - مثنوی "جوش عشق" اور "خواب خیال" بھی پڑھنے کے قابل ہیں - اگرچہ بظاہر یہ محض خیالی ہیں اور عالم خیال میں بڑے لطف کے ساتھہ تخیل کی جولانی دکھائی ہے - لیکن خیال کی وسیع فضا میں ایسے واقعات کی کمی نہیں اسی طرح جھوٹ کی مذمت، مناجات عاشقاں، عشق خانہاں آباد کی مثنویاں بھی اپنی اپنی جگہ پر بہت پر لطف ہیں- مثنویوں میں بھی میر صاحب کا انداز بیان بہت سادہ اور دلگداز ہے - اس سے پہلے اُردو میں مثنوی کا یہ انداز کہیں نہیں پایا جاتا - مثنوی اصناف نظم میں بہت مشکل ہے، میر صاحب نے اسے خوب نبھایا ہے - اُردو زبان میں میر صاحب کی مثنویاں سب سے پہلا اور عمدہ نمونہ ہیں، مثنوی کو اُنھیں کی بدولت ترقی ہوئی، اور میر حسن اور شوق وغیرہ سب انھیں کے مقلد ہیں - البتہ خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی میر اثر کی مثنوی "خواب و خیال" ایک ایسی نظم ہے جو روز مرہ کی صفائی اور زبان کی خوبی کے لحاظ سے کہیں بڑھی ہوئی ہے لیکن وہ ہجر و وصل، راز و نیاز، تغافل معشوقانہ اور سراپا کی داستان ہے، جس میں قصے کا سا کوئی تسلسل نہیں اور اس کے آگے میر صاحب کی مثنوی "شعلۂ عشق"

کو کسی طرح نہیں پہنچتی، بلکہ اس سے مقابلہ کرنا ہی فضول ہے۔ میر کی مثنویوں کے متعلق مولانا حالی کی راے بہت سچی اور جچی تلی ہے۔–

" اب تک اُردو میں جتنی عشقیہ مثنویاں ہماری نظر سے گزری ہیں اُن میں سے صرف تین شخصوں کی مثنوی ایسی ہے جس میں شاعری کے فرائض کم و بیش ادا ہوے ہیں، اول میر تقی جنھوں نے غالباً سب سے اول چند عشقیہ قصے اُردو مثنوی میں بیان کئے ہیں۔ جس زمانے میں میر نے یہ مثنویاں لکھی ہیں اُس وقت اُردو زبان میں فارسیت بہت غالب تھی اور مثنوی کا کوئی نمونہ اُردو زبان میں غالباً موجود نہ تھا اور اگر ایک آدھ نمونہ موجود بھی ہو تو اُس سے چنداں مدد نہیں مل سکتی۔ اس کے سوا اگرچہ غزل کی زبان بہت منجھ گئی تھی مگر مثنوی کا راستہ صاف ہونے تک ابھی بہت زمانہ درکار تھا اسی لئے میر کی مثنویوں میں فارسی ترکیبیں، فارسی محاورں کے ترجمے اور ایسے فارسی الفاظ، جن کی اب اُردو زبان متحمل نہیں ہوسکتی، اُس انداز سے جو آج کل فصیح اُردو کا معیار ہے بلا شبہ کسی قدر زیادہ پاے جاتے ہیں۔ نیز اُردو زبان کے بہت سے الفاظ و محاورات جو اب متروک ہوگئے ہیں، میر کی مثنوی میں موجود ہیں۔ اگرچہ یہ تمام باتیں میر کی غزل میں بھی کم و بیش پائی جاتی ہیں، مگر غزل میں اُن کی کھپت ہوسکتی ہے کیونکہ غزل میں اگر ایک شعر بھی صاف اور عمدہ نکل آے تو ساری غزل کو شان لگ جاتی ہے وہ عمدہ شعر لوگوں کی زبان پر چڑہ جاتا ہے اور باقی پر کن اشعار سے کچھہ سروکار نہیں رہتا، لیکن مثنوی میں جستہ جستہ اشعار کے صاف اور عمدہ ہونے سے کام نہیں چلتا۔ زنجیر کی ایک کڑی بھی ناہموار اور بے میل ہوتی ہے تو ساری زنجیر آنکھوں میں کھٹکتی ہے۔ پس اِن اسباب سے شاید میر کی مثنوی آج کل کے لوگوں کی نگاہ میں

نہ جچے مگر اس سے میر کی شاعری میں کچھ فرق نہیں آتا،
جس وقت میر نے یہ مثنوی لکھی ہے اُس وقت اس سے بہتر
زبان میں مثنوی لکھنی امکان سے خارج تھی - با این ہمہ میر
کی مثنوی اکثر اعتبارات سے امتیاز رکھتی ہے - باوجودیکہ
میر صاحب کی عمر غزل گوئی میں گزری ہے، مثنوی میں
بھی بیان کے انتظام اور تسلسل کو اُنھوں نے کہیں ہاتھہ سے
جانے نہیں دیا اور مطالب کو بہت خوبی سے ادا کیا ہے جیساکہ
ایک مشاق اور ماہر اُستاد کرسکتا ہے - اس کے سوا صاف اور
عمدہ شعر بھی میر کی مثنوی میں بہ مقابلہ اُن اشعار کے جن
میں پرانے محاورے یا فارسیت غالب ہے کچھہ کم نہیں ہیں،
صدہا اشعار میر کی مثنویوں کے آج تک لوگوں کے زبان زد
چلے آتے ہیں —

اگرچہ میر کی مثنویوں میں قصہ پن بہت کم پایا جاتا ہے
اُنھوں نے چند صحیح یا صحیح نما واقعات بطور حکایات کے
سیدھے سادے طور پر بیان کئے ہیں نہ اُن میں کسی شادی
یا تقریب یا وقت اور موسم کا بیان کیا گیا ہے، نہ کسی باغ
یا جنگل یا پہاڑ کی فضا یا اور کوئی ٹھاٹھہ دکھایا گیا ہے مگر
جتنی میر کی عشقیہ مثنویاں ہم نے دیکھی ہیں وہ سب
نتیجہ خیز اور عام مثنویوں کے بر خلاف بے شرمی اور بے حیائی
کی باتوں سے مبرا ہیں'' —

اس میں شک نہیں کہ میر کے کلام میں فارسیت کا رنگ
زیادہ ہے مگر اِس پر بھی صاف اور ستھرے اشعار بھی کثرت
سے پائے جاتے ہیں - فصاحت اور سلاست متاخرین کے کلام سے
کہیں زیادہ ہے اگرچہ میر اور اُن کے ہم عصر شعراء کے کلام میں
فارسیت غالب ہے لیکن اِس زمانے میں عربیت کا رنگ جو
غالب ہوتا جاتا ہے وہ اُس سے کچھہ کم نہیں ہے ان بزرگوں نے
تو پھر بھی یہ کیا کہ جہاں کثرت سے فارسی الفاظ اور محاورے
اور فارسی ترکیبیں داخل کیں وہاں بہت سے الفاظ کو اپنا

کرلیا اور صرف، صرف و نحو کے خراد پر چڑھا کر اُردو بنا لیا۔ لیکن آج کل یہ کوشش کی جاتی ھے کہ عربی الفاظ اور ترکیبوں کو جوں کا توں رکھا جائے ایسا نہ ھو کہ یہ مقدس الفاظ اُردو صرف و نحو کے چھو جانے سے نجس ھو جائیں - اُن بزرگوں نے زبان کو بنانے اور وسیع کرنے کی کوشش کی اور بہت بڑا احسان کیا مگر آج کل لوگ اُن کی تقلید کو ننگ سمجھتے اور اُن کی کوششوں کو "غلط العام" سے تعبیر کرتے ھیں حالانکہ وہ صحیح اصول پر چل رھے تھے اور ھم باوجود ھمہ دانی کے زبان کی اصلی ترقی و نشو و نما کے گُر سے نا واقف ھیں - ایک دوسرا فریق جو فارسی، عربی کے مقبول الفاظ نکال کر اُن کی جگہ غیر مانوس اور ثقیل سنسکرت کے الفاظ ٹھونسنا چاھتا ھے اسی نافہمی میں مبتلا ھے - ھماری رائے میں یہ دونوں زبان کے دشمن ھیں - اس رجحان کے خاص اسباب ھیں جن پر ھم اس وقت بحث کرنی نہیں چاھتے اور اُسے کسی دوسرے وقت کے لئے اُٹھا رکھتے ھیں لیکن اِس قدر ضرور جتا دینا چاھتے ھیں کہ اگر ھمیں اپنی زبان سے محبت ھے اور در حقیقت ھم اُس کی ترقی کے خواھاں ھیں تو ھمیں پھر اُسی اُصول کو اختیار کرنا چاھئے—

خود میر صاحب نے فارسی الفاظ و تراکیب کے استعمال کے متعلق اپنے تذکرۂ شعرائے اُردو یعنی "نکات الشعرا *" میں جو رائے ظاھر کی ھے وہ بہت ھی مناسب اور خوب ھے اور اب بھی قابل عمل ھے، وہ لکھتے ھیں:-

" سیوم آنکہ حرف و فعل پارسی بکار برند و ایں قبیح است چہارم آنکہ ترکیبات فارسی می آرند، اکثر ترکیب کہ مناسب

* میر صاحب کا تذکرہ نکات الشعرا ھندی بہت نایاب ھے اتفاق سے دستیاب ھو گیا اور انجمن ترقی اُردو کی طرف سے شایع ھو گیا ھے—

زبان ریختہ می اُفتد آں جائز است و ایں را غیر شاعر نمی داند و ترکیبے کہ نا مانوس ریختہ می باشد آن معیوب است و دانستن ایں نیز موقوف سلیقہ شاعری است و مختار فقیر ہمیں است، اگر ترکیب فارسی موافق گفتگوے ریختہ بود مضائقہ ندارد"—

بہر حال میر کی مثنویوں کے بیسیوں شعر جو اب تک زبانوں پر چڑھے ہوے ہیں اُس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانے میں بہت مقبول تھیں اور اب بھی تاریخی لحاظ سے، نیز اپنی بعض خوبیوں کی وجہ سے پڑھنے کے قابل ہیں۔ یہاں بطور نمونے کے ایسے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں جو اس وقت بھی زبان زد خاص و عام ہیں :

ضبط کروں میں کب تک آہ اب   چل اے خامے بسم اللہ اب

نی کعبے نی دیر کے قابل   مذہب اُن کا ہے سیر کے قابل

میر جی اس طرح سے آتے ہیں   جیسے کنجر کہیں کو جاتے ہیں

سنو اے عزیزان ذی ہوش و عقل
کہ اِس کارواں گہ سے کرنا ہے نقل
پیمبر ہے، شہ ہے کہ درویش ہے
سبھوں کو یہی راہ درپیش ہے

نہ یک بوے خوش ہی ہوا ہوگئی   وہ رنگینیء باغ کیا ہوگئی

جس کسو سے یہ پیار رکھتا ہے   عاقبت اُس کو مار رکھتا ہے

کہتے ہیں تربتے اُچھلتے ہیں   تو بے ایسے کوئی نکلتے ہیں

رفتہ رفتہ ہوا ہوں سودائی　　دور پہنچی ہے میری رسوائی

آہ جو ہمدمی سی کرتی ہے　　اب تو وہ بھی کمی سی کرتی ہے

ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھہ　　صبر رخصت ہوا ایک آہ کے ساتھہ

میر صاحب کی رباعیات بھی کچھہ کم پر لطف نہیں اور بعض تو بہت اچھی ہیں اِن کے علاوہ متفرق ـ مخمس، مستزاد اورفرد وغیرہ ہیں لیکن میر کا اصل رنگ غزل اور مثنوی ہی میں پایا جاتا ہے اور اس میں اُن کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا، وہ غزل کے بادشاہ ہیں اور اُن کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے، اہل ذوق خود پڑھ کر اِس کا اندازہ کر سکتے ہیں —

شاعر نہیں، جودیکھا توتو ہے کوئی ساحر
دوچار شعر پڑھ کر سب کو رجھا گیا ہے

بعض بعض جگہ میر صاحب نے فارسی اشعار کا اُردو میں اس خوبی سے ترجمہ کر دیا ہے کہ اصل سے بڑھ گیا ہے سعدی کا ایک شعر ہے:—

دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم
باید اول بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی!

میر صاحب فرماتے ہیں :—

پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ
اُن سے بھی تو پوچھئے تم اتنے کیوں پیارے ہوے

اس شعر میں پیارے کے لفظ نے جو حسن پیدا کردیا ہے وہ اہل ذوق سے پوشیدہ نہیں - سعدی کا ایک اور شعر ہے :

گفتہ بودم چو بیائی غم دل با تو بگویم
چہ بگویم کہ غم از دل برود چوں تو بیائی

میر صاحب نے اسی مضمون کو کس خوبی سے ادا کیا ہے:—

کہتے تھے کہ یوں کہتے یوں کہتے اگر آتا
سب کہنے کی باتیں ہیں کچھہ بھی نہ کہا جاتا

ایک فارسی شعر ہے :—

عنقا سرو بر گیم مپرس از فقرا ہیچ
عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ماہیچ

میر نے اس مضمون کو کس خوبی سے اپنے خاص انداز میں بیان کیا ہے :—

مشہور ہیں عالم میں توکیا ہیں بھی کہیں ہم
القصہ نہ درپے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

کہتے ہیں کہ انسان کا طرز بیان اُس کی سیرت کا پر تو ہوتا ہے ' یہ مقولہ شاعر کے کلام پر اور بھی زیادہ صادق آتا ہے - لیکن غالباً کسی شاعر کے کلام پر اس کی طبیعت اور سیرت کا اس قدر اثر نہ پڑا ہوگا جتنا میر کے کلام میں نظر آتا ہے - جو شخص میر کے حالات اور اُن کے اخلاق و سیرت سے واقف نہ ہو وہ اُن کے کلام کو پڑھ کر بغیر کسی تذکرے کی مدد کے خود بخود اُن کے انداز ' اُن کی طبیعت کی اُفتاد اور مزاج کو تاڑ جائیگا - اُن کے اشعار پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے ایک ایک لفظ ' طرز بیان ' ترتیب و بندش میں اُن کے قلبی واردات و احساسات کا نقشہ کھنچا ہوا ہے ' وہ شعر میں اپنا دل نکال کے رکھہ دیتے ہیں اور اُن کی جدت بیان میں صاف اُن کے تیور نظر آتے ہیں - میر صاحب کی سیرت اُن کے کلام سے کچھہ کم قابل قدر نہیں بلکہ میری رائے میں زیادہ قابل وقعت ہے - کلام میں تو صرف یہی ہے کہ اُسے پڑھ کر ایک خاص قسم کی لذت حاصل ہوتی ہے یا اُس کے اثر سے متاثر ہوکر لطف ملتا ہے ' لیکن سیرت کی خوبی دوسروں کی اصلاح کرتی اور اُن کو بناتی ہے - کلام کا لطف تو ممکن ہے کسی کو نہ آئے لیکن سیرت کے اثر سے بہت کم ہیں کہ متاثر نہ ہوں ' اس میں ایک زبردست اخلاقی قوت ہے جو اصلاح کا بڑا ذریعہ ہے اور کلام و سیرت میں وہی فرق ہے جو قول و فعل میں ہوتا ہے - میر کی وضعداری نے کمال کی لاج رکھہ لی - اُنھوں نے شاعری کو ذریعۂ عزت یا وسیلۂ معاش

نہیں بنایا - اُن کا صبرو استقلال ، اُن کی قناعت و بے نیازی اور اُن کی غیرت اور وضعداری وہ خوبیاں ہیں جو انسان کو کمال انسانیت پر پہنچاتی اور فرشتوں سے بڑھادیتی ہیں رنج و الم سہے مگر کبھی اُف تک نہ کی ، فاقے سے رہے مگر کیا مجال کہ بھول کر بھی زبان پر حرف شکایت آیا ہو - اور یہی نہیں بلکہ کسی دوسرے کی بھی یہ مجال نہ تھی کہ اُن سے معمولی طریقے پر سلوک کرنے کی جرأت کر سکے یا ایسا خیال بھی دل میں لاسکے - محتاج رہے مگر ممکن نہ تھا کہ کسی کے سامنے دست سوال پھیلائیں ، ان کے مذہب میں یہ کفر تھا - وہ اپنے کمال میں مگن تھے اور خود اپنے تئیں اقلیم سخن کا شہنشاہ سمجھتے تھے - وہ دنیا کے مال و دولت کو کبھی خاطر میں نہ لائے ، شاہوں کی شان وشوکت اور امیروں کی جاہ و ثروت اُن کے سامنے ہیچ تھیں - کسی کے سامنے سر جھکانا یا کسی سے اظہار مدعا کرنا اُن کے ہاں سب سے بڑی معصیت تھی —

سر کسو سے فرو نہیں ہوتا
حیف بندے ہوئے خدا نہ ہوئے

ان سے یہ توقع رکھنی کہ وہ کسی کی مدح میں قصیدہ لکھیں بالکل عبث ہے اُن کی غیرت یہ کب گوارا کر سکتی تھی کہ کسی نا اہل کی بھٹئی کریں ، یہ اُن کی فطرت کے خلاف تھا - یہی وجہ ہے کہ دوتین قصیدے جو اُنھوں نے عمر بھر میں لکھے وہ اُن کے دوسرے کلام کے سامنے بے مزہ ، پھیکے اور بے لطف ہیں کہ خود فرماتے ہیں :—

مجھ کو دماغ وصف گل و یاسمن نہیں
میں جوں نسیم باد فروش چمن نہیں

اس میں شک نہیں کہ (میر) کے کمال کی قدر خود انھیں کے زمانے میں ایسی ہوئی کہ کم کسی کو نصیب ہوی ہوگی ، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ قدر زیادہ تر اُن کے زبردست

کیرکٹر یعنی سیرت کی وجہ سے ہوئی ورنہ کمال کی قدر جیسی کچھ ہوتی ہے وہ معلوم ہے - یہ اُن کے صبر و استقلال اور استغنا و قناعت کی قوت تھی کہ اُن کے سامنے اچھوں اچھوں نے سر جھکائے اور زانوے ادب تہ کئے' یہاں تک کہ نواب آصف الدولہ اور نواب سعادت علی خاں بھی اُن کا بڑا ادب و احترام کرتے اور بڑی عزت کے ساتھ پیش آتے تھے - لیکن اُن کی نازک مزاجی اور بد دماغی کی کیفیت اُن والیان ملک سے بھی بڑھی تھی جو اوروں کے ساتھ تھی اور صبر و قناعت اور غیرت و خود داری نے اس کی لے اور بڑھادی تھی حتیٰ کہ بعض وقت وہ لوگ بھی جو اُن کے دل سے قدرداں تھے' اور اُن کی ناز برداری کو اپنا فخر سمجھتے تھے' ان کی بد دماغی سے عاجز آجاتے تھے - وہ اپنے کمال کے سامنے کسی کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتے تھے اور جاؤ بیجا بد دماغی کر بیٹھتے تھے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود بھی اِس سے واقف تھے - چنانچہ کہتے ہیں:—

حالت تو یہ کہ مجھکو غموں سے نہیں فراغ
دل شورش دروني سے جلتا ہے جوں چراغ

سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ
ہے نام مجلسوں میں مرا (میر) بے دماغ

از بسکہ کم دماغی نے پایا ہے اشتہار

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:—

تری چال ٹیـــــڑھی تری بات روکھی
تجھے میر سمجھا ہے یاں کم کسو نے

اس نازک مزاجی اور خودداری کے ہاتھوں وہ زندگی سے بیزار رہے اور ہمیشہ دُکھ درد سہتے اور خون جگر کھاتے رہے' اور اسی خون جگر سے اُنھوں نے زمین شعر کو سینچا جو آب تک تروتازہ ہے —

مجھ کو شاعر نہ کہو (میر) کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

افسوس کہ آرام و راحت، زندہ دلی اور مسرت اُن کی قسمت میں نہ تھی اور اُنھوں نے اپنی زندگی اس دنیا میں ایک حرماں نصیب قیدی کی طرح کاٹی - یہ معلوم ہوتا ہے کہ غم والم کا ایک ابر سیاہ ہمیشہ اُن پر چھایا ہوا ہے، جس میں سے خوشی کی ایک کرن بھی چھن کر اُن پر نہیں گرتی اور یہی رنگ اُن کے اشعار سے ٹپکتا ہے گویا وہ اور اُن کا کلام ایک ہوگئے ہیں اور یہ انتہائے کمال شاعری ہے - وہ اپنی اس کیفیت کو خود بیان کرتے ہیں :—

یاروئے یارلایا اپنی تو یوں ہی گزری
کیا ذکر ہمصفیراں یاران شاد ماں کا

قید قفس میں ہیں تو خدمت ہے نالگی کی
گلشن میں تھے تو ہم کو منصب تھا روضہ خواں کا

ایک دوسری غزل کے چند اشعار ہیں:—

یہ میر ستم کشتہ کسو وقت جواں تھا
انداز سخن کا سبب شور و فغاں تھا

جادو کی پُڑی پرچۂ ابیات تھا اُس کا
منہ تکئے غزل پڑھتے، عجب سحر بیاں تھا

جس راہ سے وہ دل زدہ دلّی میں نکلتا
ساتھ اُس کے قیامت کا سا ہنگامہ رواں تھا

افسردہ نہ تھا ایسا کہ جوں آب زدہ خاک
آندھی تھا، بلا تھا، کوئی آشوب جہاں تھا

غافل تھے ہم احوال دل خستہ سے اپنے
وہ گنج اسی کنج خرابہ میں نہاں تھا

باوجود اِن حالات کے اُنھوں نے خودداری کو کبھی ہاتھ سے نہیں دیا اور اضطراب میں بھی کوئی فعل اُن سے ایسا سرزد نہیں ہوا جو اُن کی شان اور وضعداری کے خلاف ہوتا

آج ہم اُن کی نازک مزاجی اور خود داری کے واقعات اور لطیفے شوق سے پڑھتے اور اُن پر فخر کرتے ہیں اور اُن سے وہی لطف حاصل ہوتا ہے جو اُن کے کلام سے ہو سکتا ہے بلکہ اثر میں اُن کے حالات اُن کے کلام سے کہیں زیادہ ہیں ' خوب کہا ہے:—

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنئے گا
پڑھتے کسی کو سنئے گا تو دیر تلک سر دھنئے گا

یہ وہ لوگ ہیں کہ باوجود مصائب و آلام کے ان کے پائے ثبات کو لغزش نہ ہوئی ' اُنھوں نے اپنے کلام کی عزت قایم رکھی اور اپنے افعال سے اس کو ذلیل نہیں کیا - کمال کی وجہ سے اُن کی عزت نہیں ہوی بلکہ ان کی وجہ سے ان کے کمال کا رتبہ دہ چند بڑھ گیا اِسی وجہ سے میر کی زندگی سبق آموز اور عبرت خیز ہے ' سبق اُن کے لئے جو کسب کمال کی راہ میں گام زن ہیں اور اُن کے گرد پیش موانعات اور سامنے ترغیبات کا جال بچھا ہوا ہے - یہی اُن کا امتحان ہے ' اُن پر لازم ہے کہ وہ رہ راست پر ثابت رہیں اور اپنے قدم میں لغزش نہ آنے دیں - عبرت ہے اُن کے لئے جو اپنے کمال کو اپنی ہوس کے پورا کرنے کا ذریعہ قرار دیتے ہیں اور اُسے ایک دوکان داری سمجھتے ہیں اور اپنی بے حمیتی سے اپنے کمال کو بٹا لگاتے ہیں - اگر کسی میں ہزار کمال ہوں لیکن اس میں میر کی سی خودداری صبر و استقلال غیرت اور وضعداری نہ ہو تو ایسے شخص کا وجود دنیا کے لئے بیکار ہے اور خود اس کے کمال کے لئے باعث ننگ وعار ہے - اُن بے تہوں * کو جنھیں اتفاق سے

* 'بے تہ' خاص میر صاحب کا لفظ ہے اُنھوں نے اسے کم مایہ کے معنوں میں استعمال کیا ہے آج کل سطحی کا لفظ استعمال ہوتا ہے جو ایک انگریزی لفظ کا ترجمہ ہے اور بے تہ کے مقابلے میں بہت بھونڈا اور ثقیل ہے - یہ لفظ استعمال کرنے اور رواج دینے کے قابل ہے -

هلدی کی گرہ ہاتھہ لگ جاتی ہے اور پنساری بن بیٹھتے ہیں، میر کی زندگی کا مطالعہ غور سے کرنا چاہئے تب اُنہیں معلوم ہوگا کہ ایک صاحب کمال کے تیورھی اور ہوتے ہیں —

میر کا کلام اور اُن کی سیرت دونوں قابل مطالعہ ہیں اور دونوں نے ملکر میر کا رتبہ اُردو شعرا میں نہایت بلند کر دیا ہے - ایسے با کمال اور صاحب سیرت لوگ کہیں مدتوں میں پیدا ہوتے ہیں اور اُن کا نقش ایسا مستقل اور گہرا ہوتا ہے کہ زمانہ مٹا نہیں سکتا، خوب کہا ہے :-

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

میر صاحب کو درباداری اور امرا کی ملاقات سے طبعاً نفرت تھی - صاحب آب حیت لکھتے ہیں کہ:-

" گورنر جنرل اور اکثر صاحبان عالیشان جب لکھنؤ جاتے تو اپنی قدردانی سے یا اِس سبب سے کہ اُن کے میر منشی اپنے علو حوصلہ سے ایک صاحب کمال کی تقریب واجب سمجھتے تھے، میر صاحب کو ملاقات کے لئے بلاتے، مگر یہ پہلو تہی کرتے اور کہتے کہ مجھہ سے جو کوئی ملتا ہے تو یا مجھہ فقیر کے خاندان کے خیال سے یا میرے کلام کے سبب سے ملتا ہے - صاحب کو خاندان سے غرض نہیں ، میرا کلام سمجھتے نہیں، البتہ کچھہ انعام دیں گے ، ایسی ملاقات سے ذلت کے سوا کیا حاصل"—

اس سے زیادہ قابل لحاظ ایک واقعہ صاحب گلشن ہند نے لکھا ہے جس کا یہاں نقل کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں :-

" جن ایام میں کہ درخواست صاحب عالیشان کی زبان دانان ریختہ کے مقدمے میں کلکتے سے لکھنؤ گئی تو پہلے کرنیل اسکات صاحب کے روبرو تقریب میر کی ہوی لیکن علت پیری سے یہ بیچارے مجہول کے معمول ہوے اور نوجوان

نو مشق سربی گری سے قوت بدنی کے مقبول ہوے - زمانہ خوش طبعوں سے نہیں خالی ہے، اکثر اہل لکھنؤ پکارتے تھے کہ کلکتے میں شاعری کی جا درخواست خالی ہے؟ کس واسطے کہ یہ جانتے سب اہل تمیز ہیں کہ آج بھی بوڑھے کے سامنے نوجوان غزرے میں موزوں ہیں - اب بھی جو بوجھ تمکنت معنی کا جرثقیل طبع سے ترازو کر کے وہ دکھاتا ہے جوان اگر کوہ بوقبیس ہے تو تحمل سے اس کے کمر چراتا ہے ''—

غالباً اس جگہ کے لئے میر شیرعلی افسوس کا انتخاب ہوا- یہ اردو زبان کی بد نصیبی تھی کہ میر صاحب کا انتخاب نہ ہوسکا - چونکہ اُن کی نظم میں غایت درجہ فصاحت و شیرینی اور سلاست اور گھلاوٹ پائی جاتی ہے- اس لئے ممکن تھا کہ وہ فورٹ ولیم کالج میں جا کر نثر میں کوی ایسی یادگار چھوڑ جاتے کہ اہل زبان اُن کی نظم کی طرح اسے سراور آنکھوں پر رکھتے اور (میر امن) کی چہار درویش کی طرح اُردو ادب میں اِس کا نام بھی روشن ہوتا —

اب ایک سوال یہ باقی ہے کہ میر کی شاعری کا اثر ان کے ہمعصروں اور ما بعد کے شاعروں پر کیا پڑا ؟ اگر چہ میرصاحب کی شاعری کی خوداُن کے زمانے میں بے انتہا قدر ہوئی اور اب تک لوگ اُن کی استادی کا لوہا مانتے ہیں لیکن حیرت ہے کہ اُن کے آخر زمانے نیز ما بعد کی شاعری پر میر کا مطلق اثر نہیں ہوا - لکھنؤ کی شاعری کا رنگ بالکل جدا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل لکھنؤ جس کلام کی اس قدر دل سے داد دیتے تھے اور جسے پڑھ پڑھ کر جھومتے اور سر دھنتے تھے اُس سے وہ مطلق متاثر نہ ہوے ا ر اُس نے ایک جدا گانہ روش اختیار کی جسے میر کے انداز سے کچھہ نسبت نہیں - مولانا حالی نے اپنے مقدمۂ شعر و شاعری میں اس کی وجہ بتائی ہے جسے یہاں بجنسہ نقل کیا جاتا ہے:-

" شجاع الدولہ کے زمانے سے سعادت علی خاں کے وقت تک

اُردو کے تمام نامور شعرا کا جمگھٹا لکھنؤ ھی میں رھا یہاں تک کہ میر، سودا، سوز، جرأت، مصحفی، اور انشا وغیرہ اخیر دم تک وھیں رھے اور وھیں مرے، مگر متاخرین کی غزل میں اُن کے طرز بیان کا اثر بہت کم پایا جاتا ھے - ظاھرا ایسا معلوم ھوتا ھے کہ جب دلّی بگڑ چکی اور لکھنؤ سے زمانہ موافق ھوا اور دلّی کے اکثر شریف خاندان اور ایک آدھ کے سوا تمام نامور شعرا لکھنؤ ھی میں جارھے اور دولت و ثروت کے ساتھہ علوم قدیمہ نے بھی ایک حد تک ترقی کی تو اُس وقت نیچرل طور پر اھل لکھنؤ کو ضرور یہ خیال پیدا ھوا ھوگا کہ جس طرح دولت اور منطق و فلسفہ وغیرہ میں ھم کو فوقیت حاصل ھے اسی طرح زبان اور لب و لہجے میں بھی ھم دلّی سے فایق رھیں، لیکن زبان میں فوقیت ثابت کرنے کے لئے ضرور تھا کہ اپنی اور دلّی کی زبان میں کوئی امر مابہ الامتیاز پیدا کرتے - چونکہ منطق و فلسفہ و طب و علم کلام وغیرہ کی مہارست زیادہ تھی خود بخود طبعیتیں اس بات کی مقتضی ھوئیں کہ بول چال میں ھندی الفاظ رفتہ رفتہ ترک اور اُن کی جگہہ عربی الفاظ کثرت سے داخل ھونے لگے یہاں تک کہ سیدھی سادی اُردو اُمرا اور اھل علم کی سوسائٹی میں متروک ھی نہیں ھوگئی بلکہ جیسا کہ ثقات سے سنا گیا ھے معیوب اور بازاریوں کی گفتگو سمجھی جانے لگی اور یہی رنگ رفتہ رفتہ نظم و نثر پر بھی غالب آگیا " —

اصل بات یہ ھے کہ ملک کی شاعری اُس کے تمدن کے تابع ھوتی ھے - جو سوسائٹی جس رنگ میں ڈوبی ھوئی ھوتی ھے اسی کی جھلک اُس کی نظم و نثر میں آجاتی ھے اگر ھم اُس زمانے کے لکھنؤ کو دیکھیں اور اُس کے تمدن پر نظر ڈالیں تو معلوم ھوگا کہ اھل لکھنؤ کے کھانے پینے، رھنے سہنے، لباس، آداب و اطوار غرض تمام طرز معاشرت میں سراسر تصنع اور تکلف پایا جاتا تھا - اُنھیں سوچ سمجھکر کسی خاص امتیاز

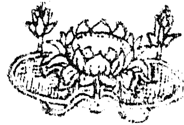
کے پیدا کرنے کی ضرورت نہ تھی بلکہ جو عام روشن زندگی کے
ہر شعبے میں نظر آتی تھی، اُسی میں اُن کا علم ادب بھی
رنگا ہوا تھا - اس میں شک نہیں کہ منطق و فلسفہ اور
علم کلام کی مہارت نے اُن کے علم ادب پر اثر ڈالا لیکن اس سے قبل
دلّی میں بھی ان علوم کا چرچا تھا اور دور دور سے طالب علم
ان علوم کی تحصیل کے لئے وہاں آتے تھے، لیکن وہاں کی بول چال
اور نظم و نثر پر کبھی ایسا برا اثر نہیں پڑا - مگر اُس زمانے
کے لکھنؤ کی ممتاز خصوصیت تصنع اور تکلف تھی اور یہ اُن کے
تمدن کے ہر پہلو اور ہر شعبے میں صاف نظر آتی ہے - وہ
نئی تراش خراش اور جدت پر مٹے ہوے تھے اور عوام و خواص
میں اس کی بڑی قدر ہوتی تھی، اس لئے سب کے سب اُدھر
ہی ڈھل گئے اور ساری ہمت تکلفات میں صرف کردی -
سادگی کی جگہ بناوٹ نے اور فطرت کی جگہ صنعت نے لے لی -
میر اور اُن کے ہم عصروں کا اثر زائل ہوگیا اور اُن کے بجاے
دوسرے اُستاد پیدا ہوے جو اُس سوسائٹی کے سپوت اور اُس تمدن
کے پروردہ تھے - حضرت ناسخ اور اُنکے بعد خواجہ وزیر، صبا، رشک
اور امانت وغیرہ کے کلام میں سواے ضلع جگت، لفظی مناسبت
اور تلازمہ اور دیگر تکلفات کے کچھہ بھی نہیں - نثر میں
اس کا سب سے عمدہ نمونہ مرزا رجب علی سرور کا فسانہ عجائب
ہے - اس دور کا اثر ایک مدت تک رہا اور شاید اب
بھی لکھنؤ کی سر زمین میں کہیں کہیں باقی ہو - لیکن یہ
چلنے والی چیز نہ تھی آخر اس کا زور ٹوٹا جس میں
بیرونی اثر کو بھی دخل ہے - میر مجروح اور مولانا حالی کے
کلام میں کچھہ کچھہ میر کا رنگ نظر آتا ہے - نثر میں
فورٹ ولیم کالج، مرزا غالب، سر سید احمد خاں، مولانا حالی،
مولوی محمد حسین آزاد وغیرہ نے ایک نئی روح پھونکی -
انجمن پنجاب نے بھی اُردو نظم و نثر کی اصلاح میں مدد دی -
یہ اثر زیادہ تر مغربی رنگ نے پیدا کیا - آج کل اُردو پھر

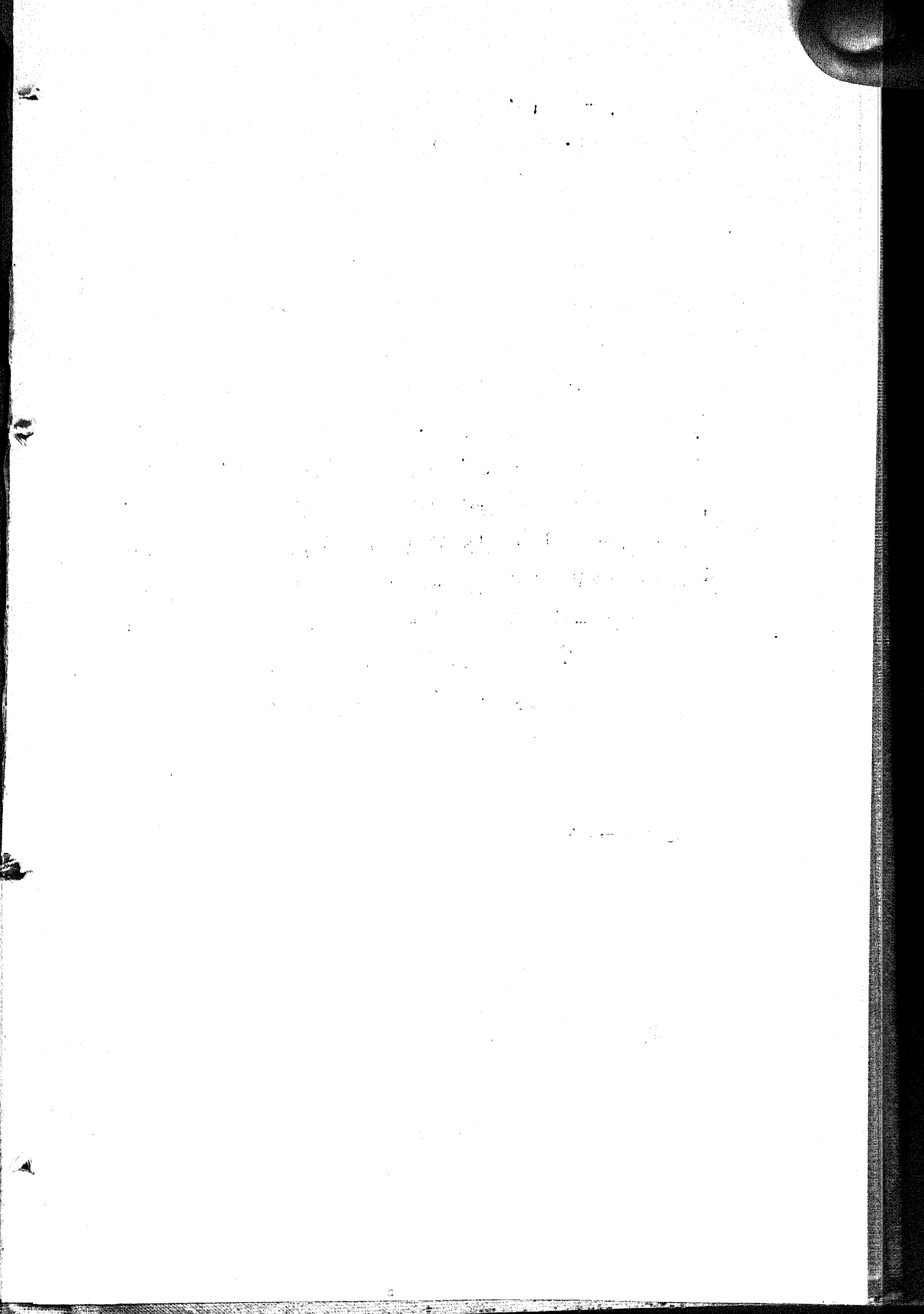
ایک تذبذب کی حالت میں ہے - ہندو مسلمان کے اختلاف نے اُردو پر بہت برا اثر ڈالا ہے، ایک فریق عربی پر تلا ہوا ہے اور دوسرا فریق سنسکرت پر - دونوں غلطی پر ہیں - زمانے کے اقتضا سے زبان بچ نہیں سکتی اور یہ اُسی کا اثر ہے - لیکن جو اسباب اُس کے باعث ہوے ہیں وہ سب عارضی ہیں اور قایم رہنے والے نہیں - جب لوگ اُردو زبان کی تاریخ، اُس کی ابتدا اور اُس کے نشوو نما پر غور کریں گے اور زبان کے عمدہ نمونے اُن کے پیش نظر ہوں گے تو وہ اس بیراہ روی سے خود بخود باز آجائیں گے جس میں سب سے بڑی تقویت مغربی تعلیم، وہاں کے عمدہ نمونوں اور صحیح تنقیدی اصولوں سے ملیگی اور گو میر کا حقیقی اور اصلی رنگ واپس نہ آے مگر اُس کا کلام پھر بھی اسی شوق و ذوق سے پڑھا جاے گا اور جس حسن و سادگی کو ہم بھولے ہوے ہیں اُس کی یاد کو تازہ کرتا رہے گا اور ہمیں بھٹکنے سے روکتا رہے گا - یہ کیا کم احسان ہے؟—

سہل ہے (میر) کا سمجھنا کیا؟

ہر سخن اُس کا اِک مقام سے ہے

عبدالحق





بسم اللہ الرحمن الرحیم

انتخاب غزلیات

ردیف الف

تھا مستعار حسن سے اُس کے جو نور تھا
خورشید میں بھی اُس ہی کا ذرہ ظہور تھا

ہنگامہ گرم کن جو دل نا صبور تھا
پیدا ہر ایک نالے سے شور نشور تھا

پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں
معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا

آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم
یک شعلہ برق خرمن صد کوہ طور تھا

مجلس میں رات ایک ترے پر توے بغیر
کیا شمع کیا پتنگ ہر اک بے حضور تھا

منعم کے پاس قاقم و سنجاب تھا تو کیا
اُس رند کی بھی رات کٹتی جو کہ عور تھا

ہم خاک میں ملے تو ملے لیکن اے سپہر
اُس شوخ کو بھی راہ پہ لانا ضرور تھا

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا
یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا

کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھو کسو کا سر پر غرور تھا
تھا وہ تو رشک حور بہشتی ہمیں میں میر
سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنے قصور تھا

کیا میں بھی پریشانی خاطر سے قریں تھا
آنکھیں تو کہیں تھیں دل غم دیدہ کہیں تھا
آیا تو سہی وہ کوئی دم کے لئے لیکن
ہونٹوں پہ مرے جب نفس باز پسیں تھا
شب کوفت سے ھجراں کی جہاں تن پہ رکھا ھاتھہ
جو درد و الم تھا سو کہے تو کہ وھیں تھا
نام آج کوئی یاں نہیں لیتا ھے اُنھوں کا
جن لوگوں کے کل ملک یہ سب زیر نگیں تھا
مسجد میں امام آج ھوا آکے وھاں سے
کل تک تو یہی میر خرابات نشیں تھا

لطف اگر یہ ھے بتاں صندل پیشانی کا
حسن کیا صبح کے پھر چہرۂ نورانی کا
کفر کچھہ چاھئے اسلام کی رونق کے لئے
حسن زنار ھے تسبیح سلیمانی کا
درھمی حال کی ھے سارے مرے دیواں میں
سیر کر تو بھی یہ مجموعہ پریشانی کا
جان گھبراتی ھے اندوہ سے تن میں کیا کیا
تنگ احوال ھے اس یوسف زندانی کا
کھیل لڑکوں کا سمجھتے تھے محبت کے تئیں
ھے بڑا حیف ھمیں اپنی بھی نادانی کا
اُس کا منہ دیکھہ رھا ھوں سو وھی دیکھوں ھوں
نقش کا سا ھے سماں میری بھی حیرانی کا

بت پرستی کو تو اسلام نہیں کہتے ہیں
معتقد کون ہے میر ایسی مسلمانی کا

جامۂ هستی عشق اپنا مگر کم گھیر تہا
دامن تر کا مرے دریا ھی کا سا پھیر تھا
دیر میں کعبہ گیا میں خانقہ سے ابکی بار
راہ سے مے خانے کی اُس راہ میں کچھہ پھیر تھا
بلبلوں نے کیا گل افشاں میر کا مرقد کیا
دور سے آیا نظر تو پھولوں کا یک ڈھیر تھا

اس عہد میں الہی محبت کو کیا ہوا
چھوڑا وفا کو اُن نے مروت کو کیا ہوا
اُمیدوار وعدۂ دیدار مر چلے
آتے ھی آتے یارو قیامت کو کیا ہوا
بخشش نے مجھکو ابر کرم کی کیا خجل
اے چشم جوش اشک ندامت کو کیا ہوا
جاتا ہے یار تیغ بکف غیر کی طرف
اے کشتۂ ستم تری غیرت کو کیا ہوا

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا
جگر ھی میں یک قطرۂ خوں ہے سرشک
پلک تک گیا تو تلاطم کیا

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھہ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا
عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

ناحق هم مجبوروں پر یہ تہمت هے مختاری کی
چاهتے هیں سو آپ کریں هیں هم کو عبث بد نام کیا
کس کا کعبہ کیسا قبلہ کون حرم هے کیا احرام
کوچے کے اُس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا
یاں کے سپید و سیہ میں هم کو دخل جو هے سو اتنا هے
رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا
میر کے دین و مذهب کو اب پوچھتے کیا هو اُن نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

چمن میں گل نے جو کل دعوئے جمال کیا
جمال یار نے منہ اُس کا خوب لال کیا
بہار رفتہ پھر آئی ترے تماشے کو
چمن کو یمن قدم نے ترے نہال کیا
لگا نہ دل کو کہیں کیا سنا نہیں تونے
جو کچھہ کہ میر کا اس عاشقی نے حال کیا

منعم نے بنا ظلم کی رکھہ گھر تو بنایا
پر آپ کوئی رات هی مہمان رهے گا
چھوٹوں کہیں ایذا سے لگا ایک هی جلاد
تا حشر مرے سر پہ یہ احسان رهے گا
چیتے رهیں گے دشت محبت میں سر و تیغ
محشر تئیں خالی نہ یہ میدان رهے گا
جانے کا نہیں شور سخن کا مرے هرگز
تا حشر جہاں میں مرا دیوان رهے گا

۳

جس سر کو غرور آج هے یاں تاجوری کا
کل اس پہ یہیں شور هے پھر نوحہ گری کا

۳/

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

ہر زخم جگر داور محشر سے ہمارا
انصاف طلب ہے تری بیداد گری کا

اپنی تو جہاں آنکھ لڑی پھر وہیں دیکھو
آئینے کو لپکا ہے پریشاں نظری کا

صد موسم گل ہم کو تہ بال ہی گزرے
مقدور نہ دیکھا کبھو بے بال پری کا

تک میر جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسہ ہے چراغ سحری کا

منہ تکا ہی کرے ہے جس تس کا
حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

تھے بڑے مبغچوں کے تیور لیک
شیخ مے خانے سے بھلا کھسکا

فیض اے ابر چشم تر سے اٹھا
آج دامن وسیع ہے اس کا

تاب کس کو جو حال میر سنے
حال ہی اور کچھ ہے مجلس کا

دعوی کیا تھا گل نے تیرے رخ سے باغ میں
سیلی لگی صبا کی سو منہ لال ہو گیا

پودھا ستم کا جس نے اس باغ میں لگایا
اپنے کئے کا اُس نے ثمرہ شتاب دیکھا

آباد جس میں تجھکو دیکھا تھا ایک مدت
اس دل کی مملکت کو اب ہم خراب دیکھا

لیتے ہی نام اس کا سوتے سے چونک اُٹھا
ہے خیر میر صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا

مر رہتے جو گل بن تو سارا یہ خلل جاتا
نکلا ہی نہ جی ورنہ کانٹا سا نکل جاتا

میں گریۂ خونی کو روکے ہی رہا ورنہ
یک دم میں زمانے کا یہاں رنگ بدل جاتا

بن پوچھے کرم سے وہ جو بخش نہ دیتا تو
پرسش میں ہماری ہی دن حشر کا ڈھل جاتا

مانند شمع مجلس شب اشکبار پایا
القصہ میر کو ہم بے اختیار پایا

احوال خوش انھوں کا ہم بزم ہیں جو تیرے
افسوس ہے کہ ہم نے واں کا نہ بار پایا

شہر دل ایک مدت اجڑا بسا غموں میں
آخر اُجاڑ دینا اُس کا قرار پایا

اتنا نہ دل سے ملتے نا دل کو کھوکے روتے
جیسا کیا تھا ہم نے ویسا ہی یار پایا

کیا اعتبار یاں کا پھر اس کو خوار دیکھا
جس نے جہاں میں آکر کچھ اعتبار پایا

آہوں کے شعلے جس جا اُٹھے ہیں میر سے شب
واں جاکے صبح دیکھا مشت غبار پایا

یا روے یا رلایا اپنی تو یونہی گزری
کیا ذکر ہم صفیران یاران شادمان کا

قید قفس میں ہیں تو خدمت ہے نالگی کی
گلشن میں تھے تو ہم کو منصب تھا روضہ خواں کا

پوچھو تو میر سے کیا کوئی نظر پڑا ہے
چہرہ اُتر رہا ہے کچھ آج اُس جواں کا

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دل ستم زدہ کو ہمنے تھام تھام لیا

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

اگرچہ گوشہ گزیں ہوں میں شاعروں میں میر
یہ میرے شور نے روے زمیں تمام لیا

سیر کے قابل ہے دل صد پارہ اُس نخچیر کا
جس کے ہر ٹکڑے میں ہو پیوست پیکاں تیر کا

سب کھلا باغ جہاں الا وہ حیران و خفا
جس کو دل سجھے تھے ہم سوغنچہ تھا تصویر کا

کیونکہ نقاش ازل نے نقش ابرو کا کیا
کام ہے اک تیرے منہ پر کھینچنا شمشیر کا

رھگزر سیل حوادث کا ہے بے بنیاد دہر
اس خرابے میں نہ کرنا فکر تم تعمیر کا

بس طبیب اُٹھ جا مرے بالیں سے مت دے دردسر
کام یاں آخر ہوا اب فائدہ تدبیر کا

کس طرح سے مانئے یارو کہ یہ عاشق نہیں
رنگ اُڑ جاتا ہے تک چہرہ تو دیکھو میر کا

موجیں کرے ہے بحر جہاں میں ابھی تو تو
جانے گا بعد موگ کہ عالم حباب تھا

اُگتے تھے دست بلبل و دامان گل بہم
صحن چمن نمونۂ یوم الحساب تھا

تک دیکھہ آنکھیں کھول کے اس دم کی حسرتیں
جس دم یہ سوجھے گی کہ یہ عالم بھی خواب تھا

گل کو محبوب میں قیاس کیا
فرق نکلا بہت جو باس کیا

دل نے ہم کو مثال آئینہ
ایک عالم کا روشناس کیا

کچھہ نہیں سوجھتا ہمیں اُس بن
شوق نے ہم کو بے حواس کیا

صبح تک شمع سر کو دھنتی رہی
کیا پتنگے نے التماس کیا

ایسے وحشی کہاں ہیں اے خوباں
میر کو تم عبث اُداس کیا

داغ فراق و حسرت وصل آرزوئے شوق
میں ساتھہ زیر خاک بھی ہنگامہ لے گیا

اے تو کہ یاں سے عاقبت کار جائے گا
غافل نہ رہ کہ قافلہ یک بار جائے گا

موقوف حشر پر ہے سو آتے بھی وے نہیں
کب درمیاں سے وعدۂ دیدار جائے گا

آنے میں اُس کے حال ہوا جائے ہے تغیر
کیا حال ہوگا پاس سے جب تار جائے گا

جو سدا ہشیار اس مے خانے میں تھا بے خبر
شوق ہی باقی رہا ہم کو دل آگاہ کا

باندھ مت رونے کا تار اے نا قبا حت فہم چشم
اس سے پا یا جائے ہے سر رشتہ جی کی چاہ کا

ہے اُس کے حرف زیر لبی کا سبھوں میں ذکر
کیا بات تھی کہ جس کا یہ بستار ہو گیا

ہم خستہ دل ہیں تجھہ سے بھی نازک مزاج تر
تیوری چڑھائی تو نے کہ یاں جی نکل گیا

گرمی عشق مانع نشو و نما ہوئی
میں وہ نہال تھا کہ اُگا اور جل گیا

مستی میں چھوڑ دیر کو کعبے چلا تھا میں
لغزش بڑھی ہوئی تھی و لیکن سنبھل گیا

ملا ہے خاک میں کس کس طرح کا عالم یاں
نکل کے شہر سے تک سیر کر مزاروں کا

تڑپ کے مرنے سے دل کے کہ مغفرت ہو اُسے
جہاں میں کچھہ تو رہا نام بے قراروں کا

تڑپ کے خرمن گل پر کہیں گرا ے بجلی
جلانا کیا ہے مرے آشیاں کے خاروں کا

تمھیں تو زهد و ورع پر بہت ہے اپنے غرور
خدا ہے شیخ جی ہم بھی گنہگاروں کا

گزر ابنائے چرخ سے نالہ پگاہ کا
خانہ خراب ہوجیو اس دل کی چاہ کا

آنکھوں میں جی مرا ہے اِدھر دیکھتا نہیں
مرتا ہوں میں تو ہائے رے صرفہ نگاہ کا

یک قطرہ خون ہو کے پلک سے ٹپک پڑا
قصہ یہ کچھ ہوا دل غفراں پناہ کا

بدنام و خوار و زار و نزار و شکستہ حال
احوال کچھ نہ پوچھئے اس روسیاہ کا

ظالم زمیں سے لوٹتا دامن اٹھا کے چل
ہوگا کمیں میں ہاتھ کسو دادخواہ کا

اے تاج شہ نہ سر کو فرو لاؤں تیرے پاس
ہے معتقد فقیر نمد کی کلاہ کا

دل سے شوق رخ نکو نہ گیا
جھانکنا تاکنا کبھو نہ گیا

ہر قدم پر تھی اس کی منزل لیک
سر سے سودائے جستجو نہ گیا

سب گئے ہوش و صبر و تاب و تواں
لیکن اے داغ! دل سے تو نہ گیا

دل میں کتنے مسودے تھے ولے
ایک پیش اس کے روبرو نہ گیا

سبحہ گرداں ہی میر ہم تو رہے
دست کوتاہ تا سبو نہ گیا

دم صبح بزم خوش جہاں شب غم سے کم نہ تھی مہرباں
کہ چراغ تھا سو تو دود تھا جو پتنگ تھا سو غبار تھا

دل خستہ جو لوہو ہو گیا تو بھلا ہوا کہ کہاں تلک
کبھو سوز سینہ سے داغ تھا کبھو درد و غم سے فگار تھا

دل مضطرب سے گزر گئی شب وصل اپنی ہی فکر میں
نہ دماغ تھا نہ فراغ تھا نہ شکیب تھا نہ قرار تھا

یہ تمہاری ان دنوں دوستاں مژہ جس کے غم میں ہے خوں چکاں
وہی آفت دل عاشقاں کسو وقت ہم سے بھی یار تھا

نہیں تازہ دل کی شکستگی یہی درد تھا یہی خستگی
اسے جب سے ذوق شکار تھا اُسے زخم سے سروکار تھا
کبھو جاے گی جو ادھر صبا تو یہ کہیو اُس سے کہ بے وفا
مگر ایک میر شکستہ پا ترے باغ تازہ میں خار تھا

مہر کی تجھہ سے توقع تھی ستمگر نکلا
موم سمجھے تھے ترے دل کو سو پتھر نکلا
اشک تر قطرۂ خوں لخت جگر پارۂ دل
ایک سے ایک عدو آنکھہ سے بہتر نکلا
ہم نے جانا تھا لکھے گا تو کوئی حرف اے میر
پر ترا نامہ تو اک شوق کا دفتر نکلا

پھوڑا سا ساری رات جو پکتا رہے گا دل
تو صبح تک تو ھاتھہ لگایا نہ جاے گا
اب دیکھہ لے کہ سینہ بھی تازہ ھوا ھے چاک
پھر ہم سے اپنا حال دکھایا نہ جاے گا
گو بے ستوں کو ٹالدے آگے سے کوہکن
سنگ گران عشق اُٹھایا نہ جاے گا
یاد اُس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ
نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے

دنیا کی نہ کر تو خواستگاری
اس سے کبھو بہرہ ور نہ ھو گا
آ خانہ خرابی اپنی مت کر
قحبہ ھے یہ اُس سے گھر نہ ھو گا

مت رنجہ کر کسی کو کہ اپنے تو اعتقاد
دل ڈھاے کر جو کعبہ بنایا تو کیا ھوا

میں صید ناتواں ہوں تجھے کیا کروں گا یاد
ظالم یک اور تیر لگایا تو کیا ہوا

کیا کیا دعائیں مانگی ہیں خلوت میں شیخ یوں
ظاہر جہاں سے ہاتھ اُٹھایا تو کیا ہوا

وہ فکر کر کہ چاک جگر پاے التیام
ناصح جو تونے جامہ سلایا تو کیا ہوا

جیتے تو میر اُن نے مجھے داغ ہی رکھا
پھر گور پر چراغ جلایا تو کیا ہوا

دل جو تھا اک آبلہ پھوٹا گیا
رات کو سینہ بہت کوٹا گیا

میں نہ کہتا تھا کہ منہ کر دل کی اور
اب کہاں وہ آئینہ ٹوٹا گیا

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

میر کس کو اب دماغ گفتگو
عمر گزری ریختہ چھوٹا گیا

اے دوست کوئی مجھ سا رسوا نہ ہوا ہوگا
دشمن کے بھی دشمن پر ایسا نہ ہوا ہوگا

ٹک گور غریباں کی کر سیر کہ دنیا میں
ان ظلم رسیدوں پر کیا کیا نہ ہوا ہوگا

اس کہنہ خرابی میں آبادی نہ کر منعم
ایک شہر نہیں یاں جو صحرا نہ ہوا ہوگا

آنکھوں سے تری ہم کو ہے چشم کہ اب ہووے
جو فتنہ نہ دنیا میں برپا نہ ہوا ہوگا

جز مرتبۂ کل کو حاصل کرے ہے آخر
یک قطرہ نہ دیکھا جو دریا نہ ہوا ہوگا

حق ڈھونڈنے کا آپ کو آتا نہیں ورنہ
عالم ہے سبھی یار کہاں یار نہ پایا
مربوط ہیں تجھ سے بھی یہی ناکس و نااہل
اس باغ میں ہم نے گل بے خار نہ پایا

خواہ مجھ سے لڑ گیا اب خواہ مجھ سے مل گیا
کیا کہوں اے ہم نشیں میں تجھ سے حاصل دل گیا
دل سے آنکھوں میں لہو آتا ہے شاید رات کو
کش مکش میں بے قراری کی یہ پھوڑا چھل گیا
اپنے ہی دل کو نہ ہو واشد تو کیا حاصل نسیم
گو چمن میں غنچۂ پژمردہ مجھ سے کھل گیا
رشک کی جاگہ ہے مرگ اُس کشتۂ حسرت کی میر
نعش کے ہمراہ جس کی گور تک قاتل گیا

دشمنی ہم سے کی زمانے نے — جو جفا کار تجھ سا یار کیا
یہ توہم کا کارخانہ ہے — یاں وہی ہے جو اعتبار کیا
صدرگ جاں کو تاب دے باہم — تیری زلفوں کا ایک تار کیا
ہم فقیروں سے بے ادائی کیا — آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا
سخت کافر تھا جس نے پہلے میر — مذہب عشق اختیار کیا

دو دن گئے کہ آنکھیں دریا سی بہتیاں تھیں
سوکھا پڑا ہے اب تو مدت سے یہ دو آبا
اِن صحبتوں میں آخر جانیں ہی جاتیاں ہیں
نے عشق کو ہے صرفہ نے حسن کو محابا

قطعہ

آئی نظر جو گور سلیماں کی ایک روز
لوحے پر اُس مزار کے تھا یہ رقم ہوا

کاے سر کشاں! جہاں میں کھینچا تھا میں بھی سر
پایان کار مور کی خاک قدم ہوا
کیا کیا عزیز دوست ملے میر خاک میں
نادان یاں کسو کا کسو کو بھی غم ہوا

دل و دماغ ہے اب کس کو زندگانی کا
جو کوئی دم ہے تو افسوس ہے جوانی کا
اگرچہ عمر کی دس دن یے اب رہے خاموش
سخن رہے گا سدا میری کم زبانی کا
ہزار جان سے قربان بے پری کے میں
خیال بھی کبھی گزرا نہ پرفشانی کا
نمود کرکے وہیں بحر غم میں بیٹھ گیا
کہے تو میر بھی یک بلبلا تھا پانی کا

بتاں کے عشق نے بے اختیار کر ڈالا
وہ دل کہ جس کا خدائی میں اختیار رہا
وہ دل کہ شام و سحر جیسے پکا پھوڑا تھا
وہ دل کہ جس سے ہمیشہ جگر فگار رہا
تمام عمر کٹی اس پہ ہاتھ رکھتے ہیں
وہ درد ناک علی‌الرغم بے قرار رہا
ستم میں غم میں سر انجام اُس کا کیا کہئے
ہزاروں حسرتیں تھیں تسپہ جی کو مار رہا
بہا تو خون ہو آنکھوں کی راہ بہ نکلا
رہا جو سینۂ سوزاں میں داغدار رہا
سو اُس کو ہم سے فراموش کار یوں لے گئے
کہ اس سے قطرۂ خوں بھی نہ یادگار رہا
گلی میں اُس کے گیا سو گیا نہ بولا پھر
میں میر میر کر اُس کو بہت پکار رہا

جیتے جی کوچۂ دلدار سے جایا نہ گیا
اُس کی دیوار کا سر سے مرے سایہ نہ گیا

دل کے تئیں آتش ہجراں سے بچایا نہ گیا
گھر جلا سامنے پر ہم سے بجھایا نہ گیا

دل میں رہ دل میں کہ معمار قضا سے اب تک
ایسا مطبوع مکاں کوئی بنایا نہ گیا

کیا تنک حوصلہ تھے دیدہ و دل اپنے آہ
ایک دم راز محبت کا چھپایا نہ گیا

دل جو دلدار کا قاتل کے بہت بھوکا تھا
اس ستم کشتہ سے یک زخم بھی کھایا نہ گیا

شہر دل آہ عجب جائے تھی پر اُس کے گئے
ایسا اُجڑا کہ کسی طرح بسایا نہ گیا

سر نشیں رہ مے خانہ ہوں میں کیا جانوں
رسم مسجد کے تئیں شیخ کہ آیا نہ گیا

گریباں سے رہا کوتہ تو پھر ہے
تمہارے ہاتھ میں دامن ہمارا

بلا جس چشم کو کہتے ہیں مردم
وہ ہے عین بلا مسکن ہمارا

ہوا رونے سے راز دوستی فاش
ہمارا گریہ تھا دشمن ہمارا

کیا تھا ریختہ پردہ سخن کا
سو ٹھیرا ہے یہی اب فن ہمارا

گلیوں میں اب تلک بھی مذکور ہے ہمارا
افسانۂ محبت مشہور ہے ہمارا

مقصود کو تو دیکھیں کب تک پہنچتے ہیں ہم
بالفعل اب ارادہ تاگور ہے ہمارا

ھیں مشت خاک لیکن جو کچھ ھیں میر ھم ھیں
مقدور سے زیادہ مقدور ھے ھمارا

ابتداے عشق ھے روتا ھے کیا
آگے آگے دیکھیئے ھوتا ھے کیا

قافلے میں صبح کے اک شور ھے
یعنی غافل ھم چلے سوتا ھے کیا

سبز ھوتی ھی نہیں یہ سرزمیں
تخم خواھش دل میں توبوتاھے کیا

یہ نشان عشق ھیں جاتے نہیں
داغ چھاتی کے عبث دھوتا ھے کیا

غیرت یوسف ھے یہ وقت عزیز
میر اس کو رایئگاں کھوتا ھے کیا

ھم نہ کہتے تھے کہ مت دیر و حرم کی راہ چل
اب یہ دعوی حشر تک شیخ و برھمن میں رھا

رنگ اُڑ چلا چمن میں گلوں کا توکیا نسیم
ھم کو تو روزگار نے بے بال و پر کیا

نافع جو تھیں مزاج کو اول سو عشق میں
آخر اُنھیں دواؤں نے ھم کو ضرر دیا

کیاجانوں بزم عیش کہ ساقی کی چشم دیکھہ
میں صحبت شراب سے آگے سفر کیا

جسدم کہ تیغ عشق کھچی بوالھوس کہاں
سن لیجئیے کہ ھم ھی نے سینہ سپر کیا

وہ دشت خوف ناک رھا ھے مرا وطن
سن کر جسے خضر نے سفر سے حذر کیا

ہاتھہ سے تیرے اگر میں ناتواں مارا گیا
سب کہیں گے یہ کہ کیا؟ اک نیمجاں مارا گیا
اک نگاہ سے بیش کچھہ نقصاں نہ آیا اُس کے تئیں
اور میں بے چارہ تو اے مہرباں مارا گیا
وصل و ہجراں سے جو دو منزل ہیں راہ عشق کی
دل غریب اُن میں خدا جانے کہاں مارا گیا
جس نے سر کھینچا دیار عشق میں اے بوالہوس
وہ سراپا آرزو آخر جواں مارا گیا

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا — لہو آتا ہے جب نہیں آتا
ہوش جاتا نہیں رہا لیکن — جب وہ آتا ہے تب نہیں آتا
صبر تھا ایک مونس ہجراں — سو وہ مدت سے اب نہیں آتا
دل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش — گریہ کچھہ بے سبب نہیں آتا
عشق کو حوصلہ ہے شرط ارنہ — بات کا کس کو ڈھب نہیں آتا
جی میں کیا کیا ہے اپنے اے ہمدم — پر سخن تا بلب نہیں آتا

سحر گہ عید میں دور سبو تھا
پر اپنے جام میں تجھہ بن لہو تھا
غلط تھا آپ سے غافل گزرنا
نہ سمجھے ہم کہ اس قالب میں تو تھا
چمن کی وضع نے ہم کو کیا داغ
کہ ہر غنچہ دل پر آرزو تھا
گل و آئینہ کیا خورشید و مہ کیا
جدھر دیکھا تدھر تیرا ہی رو تھا
کرو گے یاد باتیں تو کہو گے
کہ کوئی رفتہ بسیار گو تھا
جہاں پر ہے فسانے سے ہمارے
دماغ عشق ہم کو بھی کبھو تھا

مگر دیوانہ تھا گل بھی کسو کا
کہ پیراھن میں سو جاگہ رفو تھا
نہ دیکھا میر آوارہ کو لیکن
غبار اک ناتواں سا کو بکو تھا

رہ طلب میں گرے ہوتے سر کے بل ہم بھی
شکستہ پائی نے اپنی ہمیں سنبھال لیا

نہ وے زنجیر کے غل ہیں نہ وے جرگے غزالوں کے
مرے دیوان پن تک ہی رہا معمور ویرانا
مرا سرنزع میں زانوں پہ رکھکر یوں لگا کہنے
کہ اے بیمار میرے تجھہ پہ جلد آساں ہو مرجانا
نہ ہو کیوں ریختہ بے شورش و کیفیت و معنی
گیا ہو میر دیوانا رہا سودا سو مستانا

قدر رکھتی نہ تھی متاع دل
سارے عالم کو میں دکھا لایا
دل کہ یک قطرہ خوں نہیں ہے بیش
ایک عالم کے سر بلا لایا
لب پہ جس بار نے گرانی کی
اس کو یہ ناتواں اُتھا لایا
دل مجھے اُس گلی میں لیجاکر
اور بھی خاک میں ملا لایا
ابتدا ہی میں مرگئے سب یار
عشق کی کون انتہا لایا
اب تو جاتے ہیں بتکدے سے میر
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

یک وہم سی رہی ہے اپنی نمود تن میں
آتے ہوا ب تو آؤ پھر ہم میں کیا رہیگا
مذکور یار ہم سے مت ہمنشیں کیا کر
دل جو بجا نہیں ہے پھر اس میں جا رہیگا

تفحص فائدہ ناصح! تدارک تجھہ سے کیا ہوگا
وہی پاوے گا میرا درد دل جس کا لگا ہوگا
معیشت ہم فقیروں کی سی اخوان زماں سے کر
کوئی گالی بھی دے تو کہہ بھلا بھائی بھلا ہوگا
قیامت کر کے اب تعبیر جس کو کرتی ہے خلقت
وہ اس کوچے میں اک آشوب سا شاید ہوا ہوگا
کہیں ہیں میر کو مارا گیا شب اُس کے کوچے میں
کہیں وحشت میں شاید بیٹھے بیٹھے اُٹھہ گیا ہوگا

اپنے تڑپنے کی میں تدبیر پہلے کرلوں
تب فکر میں کروں گا زخموں کو بھی رفو کا
یہ عیش گہ نہیں ہے یاں رنگ اور کچھہ ہے
ہر گل ہے اس چمن میں ساغر بھرا لہو کا
بلبل غزل سرائی آگے ہمارے مت کر
سب ہم سے سیکھتے ہیں انداز گفتگو کا

سب سے مل جل کہ حادثہ ہے پھر
کہیں ڈھونڈا بھی تو نپائیے گا
کہئے گا اُس سے قصۂ مجنوں
یعنی پردے میں غم سنائیے گا
شرکت شیخ و برہمن سے میر
کعبہ و دیر سے بھی جائیے گا

اپنی ڈیڑھ اینٹ کی جدی مسجد
کسی ویرانے میں بنائیے گا

دل پہنچا ہلاکی کو نپٹ کھینچ کسالا
لے یار مرے سلمہ اللہ تعالیٰ
کچھ میں نہیں اس دل کی پریشانی کا باعث
برهم ہی مرے ہاتھ لگا تھا یہ رسالا
معمور شرابوں سے کبابوں سے ہے سب دیر
مسجد میں ہے کیا شیخ؟ پیالہ نہ نوالا
گزرے ہے لہو واں سر ہر خار سے اب تک
جس دشت میں پھوٹا ہے مرے پاؤں کا چھالا
جس گھر میں ہو جلوے سے ترے چاندنی کا فرش
واں چادر مہتاب ہے مکڑی کا سا جالا
دیکھے ہے مجھے دیدۂ پر خشم سے وہ میر
میرے ہی نصیبوں میں تھا یہ زہر کا پیالا

شہرۂ عالم اُسے یمن محبت نے کیا
ورنہ مجنوں ایک خاک افتادۂ ویرانہ تھا
اک نگاہ آشنا کو بھی وفا کرتا نہیں
وا ہوئی مژگاں کہ سبزہ سبزۂ بیگانہ تھا
روز و شب گزرے ہے پیچ و تاب میں رہتے تجھے
اے دل صد چاک کس کی زلف کا تو شانہ تھا
یاد آیامے کہ اپنے روز و شب کی جائے باش
یا در باز بیاباں یا در میخانہ تھا
غیر کے کہنے سے مارا اُن نے ہم کو بے گناہ
یہ نہ سمجھا وہ کہ واقع میں بھی تھا یا کچھ نہ تھا
شب فروغ بزم کا باعث ہوا تھا حسن دوست
شمع کا جلوہ غبار دیدۂ پروانہ تھا

شریف مکہ رہا ہے تمام عمرائے شیخ
یہ میر اب جو گدا ہے شراب خانے کا

دیر و حرم سے گزرے اب دل ہے گھر ہمارا
ہے ختم اس آبلے پر سیر و سفر ہمارا

دنیا و دیں کی جانب میلان ہو تو کہئے
کیا جانئے کہ اُس بن دل ہے کدھر ہمارا

جوں صبح اب کہاں ہے طول سخن سے فرصت
قصہ ہی کوئی دم کو ہے مختصر ہمارا

کوچے میں اُس کے جاکر بنتا نہیں پھر آنا
خوں ایک دن گرے گا اس خاک پر ہمارا

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
دل کے جانے کا نہایت غم رہا

حسن تھا تیرا بہت عالم فریب
خط کے آنے پر بھی اک عالم رہا

جامۂ احرام زاہد پر نہ جا
تھا حرم میں لیک نا محرم رہا

میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی
ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا

صبح پیری شام ہونے آئی میر
تو نہ چیتا یاں بہت دن کم رہا

ہر حرف غم نے میرے مجلس کے تئیں رلایا
گویا غبار دل کا پڑھتا کتاب نکلا

آیا جو واقعے میں درپیش عالم مرگ
یہ جاگنا ہمارا دیکھا تو خواب نکلا

چوری میں دل کی وہ هنر کر گیا
دیکھتے هی آنکھوں میں گھر کر گیا
دهر میں میں خاک بسر هی رها
عمر کو اس طور بسر کر گیا

کس کو مرے حال سے تھی آگہی
نالۂ شب سب کو خبر کر گیا
مجلس آفاق میں پروانہ ساں
میر بھی شام اپنی سحر کر گیا

سرسری تم جہان سے گزرے
ورنہ هر جا جہان دیگر تھا
دل کی کچھہ قدر کرتے رهیو تم
یہ همارا بھی ناز پرور تھا

بارے سجدہ ادا کیا تہ تیغ
کب سے یہ بوجھہ میرے سر پر تھا
اب خرابہ هوا جہان آباد
ورنہ هر ایک قدم پہ یاں گھر تھا

قطعہ

بے زری کا نہ کر گلہ غافل
رہ تسلی کہ یوں مقدر تھا
اتنے منعم جہان میں گزرے
وقت رحلت کسی کنے زر تھا
صاحب جاہ و شوکت و اقبال
یک ازاں جملہ اب سکندر تھا
تھی یہ سب کائنات زیر نگیں
ساتھہ مور و ملخ سا لشکر تھا
لعل و یاقوت و هم زر و گوهر
چاهئے جس قدر میسر تھا
آخر کار جب جہاں سے گیا
هاتھہ خالی کفن سے باهر تھا
عیب طول کلام مت کریو
کیا کروں میں سخن سے خوگر تھا
خوش رها جب تلک رها جیتا
میر معلوم ہے قلندر تھا

ماهیت دو عالم کھاتی پھرے ہے غوطے
یک قطرہ خوں یہ دل کا طوفان ہے ہمارا
کیا خانداں کا اپنے تجھ سے کہیں تقدس
روح القدس اک ادنیٰ دربان ہے ہمارا
کرتا ہے کام وہ دل جو عقل میں نہ آوے
گھر کا مشیر کتنا نادان ہے ہمارا

سارے رئیس اعضا ہیں معرض تلف میں
یہ عشق بے محابا کس کو امان دے گا
پائے پر آبلہ سے میں گم شدہ گیا ہوں
ہر خار بادیئے کا میرا نشان دے گا
نالہ ہمارا ہر شب گزرے ہے آسماں سے
فریاد پر ہماری کس دن تو کان دے گا

کل چمن میں گل و سمن دیکھا
آج دیکھا تو باغ بن دیکھا
کیا ہے گلشن میں جو قفس میں نہیں
عاشقوں کا جلا وطن دیکھا
ذوق پیکان و تیر میں تیرے
مدتوں تک جگر نے چھن دیکھا
ایک چشمک دو صد سنان مژہ
اس نکیلے کا بانک پن دیکھا
حسرت اس کی جگہ تھی خوابیدہ
میر کا کھول کر کفن دیکھا

جہاں کو فتنے سے خالی کبھو نہیں پایا
ہمارے وقت میں تو آفت زمانہ ہوا

خلش نہیں کسو خواہش کی رات سے شاید
سرشک یاس کے پردے میں دل روانہ ہوا
بھلا نشے میں جو پگڑی کا پیچ اُس کے میر
سمند ناز پہ اک اور تازیانہ ہوا

جی تو ایسے کئی صدقے کئے تجھ پر لیکن
حیف یہ ہے کہ تنک تو بھی پیشماں نہ ہوا
آہ میں کب کی کہ سرمایۂ دوزخ نہ ہوئی
کونسا اشک مرا منبع طوفاں نہ ہوا

قطعہ

گو توجہ سے زمانے کی جہاں میں مجھکو
جاہ و ثروت کا میسر سر و ساماں نہ ہوا
شکر صد شکر کہ میں ذلت و خواری کے سبب
کسی عنوان میں ہم چشم عزیزاں نہ ہوا

کیسا چمن کہ ہم سے اسیروں کو منع ہے
چاک قفس سے باغ کی دیوار دیکھنا
گر زمزمہ یہی ہے کوئی دن تو ہم صفیر
اس فصل ہی میں ہم کو گرفتار دیکھنا

زمیں اک صفحۂ تصویر بے ہوشاں سے مانا ہے
یہ مجلس جب سے ہے اچھا نہیں کچھ رنگ صحبت کا
جہاں جلوے سے اس محبوب کے یکسر لبالب ہے
نظر پیدا کر اول پھر تماشا دیکھ قدرت کا
خرابی دل کی اس حد ہے کہ یہ سمجھا نہیں جاتا
کہ آبادی بھی یاں تھی یا کہ ویرانہ تھا مدت کا

نگاہ مست نے اُس کی لٹائی خانقہ ساری
پڑا ھے برھم اب تک کارخانہ زھد و طاعت کا

جو اس شور سے میر روتا رھے گا
تو ھمسایہ کاھے کو سوتا رھے گا

میں وہ رونے والا جہاں سے چلا ھوں
جسے ابر ھر سال روتا رھے گا

مجھے کام رونے سے اکثر ھے ناصح
تو کب تک مرے منہ کو دھوتا رھے گا

بس اے گریہ آنکھیں تری کیا نہیں ھیں
جہاں کو کہاں تک ڈبوتا رھے گا

مرے دل نے وہ نالہ پیدا کیا ھے
جرس کا بھی جو ھوش کھوتا رھے گا

تو یوں گالیاں غیر کو شوق سے دے
ھمیں کچھہ کہے گا تو ھوتا رھے گا

بس اے میر مژگاں سے پونچھہ آنسوؤں کو
تو کب تک یہ موتی پروتا رھے گا

دل عشق کا ھمیشہ حریف نبرد تھا
اب جس جگہہ کہ داغ ھے یاں آگے درد تھا

قطعہ

یاں بلبل اور گل پہ تو عبرت سے آنکھہ کھول
گل گشت سرسری نہیں اس گلستان کا

گل یادگار چہرۂ خوباں ھے بے خبر
مرغ چمن نشاں ھے کسو خوش زبان کا

شیخ کیا صورتیں رہتی تھیں بھلا جب تھا دیر
رو بویرانی ہو اس کعبے کی آبادی کا
ریختہ رتبے کو پہنچایا ہوا ہے اس کا
معتقد کون نہیں میر کی اُستادی کا

سعی طوف حرم نہ کی ہرگز
آستاں پر ترے مقام کیا
تیرے کوچے کے رہنے والوں نے
یہیں سے کعبے کو سلام کیا
عشق خوباں کو میر میں اپنا
قبلہ و کعبہ و امام کیا

طالع جو خوب تھے نہ ہوا جاہ کچھہ نصیب
سر پر مرے کروڑ برس تک ہما پھرا
دیر و حرم میں کیوں کہ قدم رکھہ سکے گا میر
ایدھر تو اس سے بت پھرے اودھر خدا پھرا

خدا کو کام تو سونپے ہیں میں نے سب لیکن
رہے ہے خوف مجھے واں کی بے نیازی کا
کسو کی بات نے آگے مرے نہ پایا رنگ
دلوں میں نقش ہے میری سخن طرازی کا
بسان خاک ہو پامال راہ خلق اے میر
رکھے ہے دل میں اگر قصد سرفرازی کا

بزم عشرت میں بلا مت ہم نگوں بختوں کے تئیں
جوں حباب بادہ ساغر سر نگوں ہو جائے گا

کیا کہیے کہ خوباں نے اب ہم میں ہے کیا رکھا
اُن چشم سیاہوں نے بہتوں کو سلا رکھا
جلوہ ہے اُسی کا سب گلشن میں زمانے کے
گل پھول کو ہے اُن نے پروانہ بنا رکھا
جوں برگ خزاں دیدہ سب زرد ہوئے ہم تو
گرمی نے ہمیں دل کی آخر کو جلا رکھا

پوشیدہ راز عشق چلا جائے تھا سو آج
بے طاقتی نے دل کی وہ پردہ اُٹھا دیا
اس موج خیز دہر میں ہم کو قضا نے آہ
پانی کے بلبلے کی طرح سے مٹا دیا
سب شور ما و من کو لئے سر میں مر گئے
یاروں کو اس فسانے نے آخر سلا دیا
آوارگان عشق کا پوچھا جو میں نشاں
مشت غبار لے کے صبا نے اُڑا دیا
تکلیف درد دل کی عبث ہم نشیں نے کی
درد سخن نے میرے سبھوں کو رلا دیا

وصیت میر نے مجھ کو یہی کی
کہ سب کچھ ہونا تو عاشق نہ ہونا

کیا بعد مرگ یاد کروں گا وفا تجھے
سہتا رہا جفائیں میں جب تک جیا کیا

لذت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا
کب خضر و مسیحا نے مرنے کا مزا جانا
تھا ناز بہت ہم کو دانست پر اپنی بھی
آخر وہ برا نکلا ہم جس کو بھلا جانا

کیا پانی کے مول آکر مالک نے ھے گھر بیچا
ھے سخت گراں سستا یوسف کا بکا جانا

اے شور قیا مت ھم سوتے ھی نہ رہ جائیں
اس راہ سے نکلے تو ھم کو بھی جگا جانا

عالم کی سیر میر کی صحبت میں ہو گئی
طا لع سے میرے ھاتھہ یہ بے دست و پا لگا

حق تو سب کچھہ ھی ھے تو نا حق نہ بول
بات کہتے سر کتا منصور کا

بیچ سے کب کا گیا اب ذکر کیا
اس دل مرحوم کا مغفور کا

قطعہ

سر گئے پر خاک ھے سب کبر و ناز
مت جھکو گو سر کسو مغرور کا

ٹھیکری کو قدر ھے اُس کو نہیں
ٹوٹے جب کا سہ سر فغفور کا

یہ بھی طرفہ ماجرا ھے کہ اُسی کو چاھتا ھوں
مجھے چاھئے ھے جس سے بہت احتراز کرنا

جس شعر پر سماع تھا کل خانقاہ میں
وہ آج میں سنا تو ھے میرا کہا ہوا

پھرتا ھے زندگی کے لئے آہ خوار کیا
اس وھم کی نمود کا ھے اعتبار کیا

صحبت رہی بگڑتی ہی اس کیلئے ورسے آہ
ہم جانتے نہیں ہیں کہ ہوتا ہے پیار کیا

حیرت روئے گل سے مرغ چمن
چپ ہے یوں بے زبان ہے گویا
مسجد ایسی بھری بھری کیا ہے
میکدہ اک جہان ہے گویا
وہی شور ومزاج شیب میں ہے
میر اب تک جوان ہے گویا

ہوش اُڑ گئے سبھوں کے شور سحر سے اُس کے
مرغ چمن اگرچہ یک مشت بال و پر تھا
پھر آج یہ کہانی کل شب پر رہ گئی ہے
سوتا نہ رہتا تک تو قصہ ہی مختصر تھا
تھا وہ بھی اک زمانہ جب نالے آتشیں تھے
چاروں طرف سے جنگل جلتا دھر دھر تھا

اک نگہ ایک چشمک ایک سخن
اس میں بھی تم کو ہے تامل سا
بار مستوں نے ہوشیاری کی
دے کے کچھ محتسب کا منہ جھلسا

عشق نے کیا کیا تصرف یاں کئے ہیں آج کل
چشم کو پانی کیا سب دل کو سب لوہو کیا
کام میں قدرت کے کچھ بولا نہیں جاتا ہے ہائے
خوب رو اُس کو کیا لیکن بہت بد خو کیا

یہ میر ستم کشتہ کسو وقت جوان تھا
انداز سخن کا سبب شور و فغاں تھا
جادو کی پڑی پرچۂ ابیات تھا اُس کا
منھ تکئے غزل پڑھتے عجب سحر بیاں تھا
جس راہ سے وہ دل زدہ دلی میں نکلتا
ساتھ اُس کے قیامت کا سا ہنگامہ رواں تھا
افسردہ نہ تھا ایسا کہ جوں آب زدۂ خاک
آندھی تھا بلا تھا کوئی آشوب جہاں تھا
غافل تھے ہم احوال دل خستہ سے اپنے
وہ گنج اسی کنج خرابہ میں نہاں تھا
گو میر جہاں میں کنھوں نے تجھ کو نہ جانا
موجود نہ تھا تو تو کہاں نام و نشان تھا

دل نہ تھا ایسی جگہ جس کی نہ سدھ لیجیے کبھو
اُجڑی اس بستی کو پھر تونے بسایا ہوتا
دل سے خوش طرح مکاں پھر بھی کہیں بنتے ہیں
اس عمارت کو تو تک دیکھ کے ڈھایا ہوتا

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو
دیر سے انتظار ہے اپنا
روتے پھرتے ہیں ساری ساری رات
اب یہی روزگار ہے اپنا
دے کے دل ہم جو ہو گئے مجبور
اس میں کیا اختیار ہے اپنا
کچھ نہیں ہم مثال عنقا لیک
شہر شہر اشتہار ہے اپنا
جس کو تم آسماں کہتے ہو
سو دلوں کا غبار ہے اپنا



... جو میں جتانے لگا
... وہ ستانے لگا
تحمل نہ تھا جس کو تک سو وہ میں
ستم کیسے کیسے اُٹھانے لگا
پریشان ہیں اس وقت میں نیک و بد
موا جو کوئی وہ ٹھکانے لگا
نہیں رہتے عاقل علاقے بغیر
کہیں میر دل کو دوانے لگا

کچھہ عشق و ہوس میں فرق بھی کر
کیدھر ہے وہ امتیاز تیرا
کہتے نہ تھے میر مت کڑھا کر
دل ہو نہ گیا گداز تیرا

آنسو مری آنکھوں میں ہر دم جو نہ آجاتا
تو کام مرا اچھا پردے میں چلا جاتا
کہتے تو ہو یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا
یہ کہنے کی باتیں ہیں کچھہ بھی نہ کہا جاتا
جو عشق نہیں ہے تو یہ کیا ہے بھلا مجکو
جی خود بخود اے ہمدم کاہے کو کہا جاتا

کوئی سادہ ہی اس کو سادہ کہے
لگے ہے ہمیں تو وہ عیار سا
محبت ہے یا کوئی جی کا ہے روگ
سدا میں تو رہتا ہوں بیمار سا
مگر آنکھیں تیری بھی چپکی کہیں
ٹپکتا ہے چتون سے کچھہ پیار سا

واے احوال اُس جفا کش کا
عاشق اپنا جسے وہ جان گیا
داغ حرماں ہے خاک میں بھی ساتھہ
جی گیا پر نہ یہ نشان گیا

کل نہ آنے میں ایک یاں تیرے
آج سو سو طرف گمان گیا
دل سے مت جا کہ پھر وہ پچھتایا
ھاتھہ سے جس کے یہ مکان گیا

کون جی سے نہ جائے گا اے میر
حیف یہ ہے کہ تو جوان گیا

کل میں کہا وہ طور کا شعلہ کہاں گرا
دل نے جگر کی اور اشارت کی یاں گرا
کیا کم تھا شعلہ شوق کا شعلے سے طور کے
پتھر بھی واں کے جل گئے جاکر جہاں گرا

آتے ہی آتے تیرے یہ ناکام ہو چکا
واں کام ہی رہا تجھے یاں کام ہو چکا
تڑپے ہے جب کہ سینے میں اُچھلے ہے دو دو ھاتھہ
گر دل یہی ہے میر تو آرام ہو چکا

عجب ہم بے بصیرت ہیں کہاں کھولا ہے بار آکر
یہاں سے لوگ سب رخت سفر کرتے ہیں بار اپنا
نہ ہو یوں میکدہ مسجد ساپر واں ہوش جاتے ہیں
ہوا ہے دونوں جاگہ ایک دو باری گزار اپنا
سراپا آرزو ہم لوگ ہیں کاھے کو رندوں میں
رھے ہیں اب تلک جیتے ولے دل مار مار اپنا

میر بھی دیر کے لوگوں ھی کی سی کہنے لگا
کچھہ خدا لگتی بھی کہتا جو مسلماں ہوتا

پہلا قدم ھے انساں پامال مرگ ھونا
کیا جانے رفتہ رفتہ کیا ھو مآل تیرا
کچھہ زرد زرد چہرہ کچھہ کچھہ لاغری بدن میں
کیا عشق میں ھوا ھے اے میر حال تیرا

مجھکو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

پریشاں ھوا دوستی کر کے میں
بہت مجھکو ارمان تھا چاہ کا
اسیری کا دیتا ھے مژدہ مجھے
مرا زمزمہ گاہ و بے گاہ کا

چشم سے خوں ھزار نکلے گا
کوئی دل کا بخار نکلے گا

صاحب ھو مار ڈالو مجھے تم وگر نہ کچھہ
جز عاشقی گناہ نہیں ھے غلام کا

ھر آن تھی سر گوشی یا بات نہیں گاھے
اوقات ھے اک یہ بھی اک وہ بھی زمانہ تھا
پامالی عزیزوں کی رکھنی تھی نظر میں ٹک
اتنا بھی تمھیں آکر یاں سر نہ اُٹھانا تھا
اک محو تماشا ھیں اک گرم ھیں قصے کے
یاں آج جو کچھہ دیکھا سو کل وہ فسانا تھا

کیونکر گلی سے اُس کی میں اُٹھہ کے چلا جاتا
یاں خاک میں ملتا تھا لوھو میں نہاتا تھا

کیا صورتیں بگڑی ھیں مشتاقوں کی ھجراں میں
اُس چہرے کو اے خالق ایسا نہ بنانا تھا

مت سہل ھمیں سمجھو پہنچے تھے بہم تب ھم
برسوں تئیں گردوں نے جب خاک کو چھانا تھا

کہتا تھا کسو سے کچھہ تکتا تھا کسو کا منہ
کل میر کھڑا تھا یاں سچ ھے کہ دوانا تھا

دل جی کے اُلجھنے ھی کے جھگڑے میں کتے ھے
رات اس کے خیالات سے رھتے ھیں قضایا

تحقیق کروں کس سے حقیقت کے نشے کو
خضر آب اسے کہتا ھے آتش کہے منہ سے

دل نے کیا کیا نہ درد رات دیے
جیسے پکتا رھے کوئی پھوڑا

کیا کرے سخت مدعی تھے بلند
کوہ کن تو نے سر بہت پھوڑا

دل ھی مرغ چمن کا ٹوٹ گیا
پھول گلچیں نے ھاے کیوں توڑا

ھے لب بام آفتاب عمر
کریے سو کیا ھے میر دن تھوڑا

ابر اور جوش گل ھے چل خانقہ سے صوفی
ھے لطف میکدے میں وہ چند اس ھوا کا

کیونکر بسر کرے غم و غصہ میں ہجر کے
خوگر ہو جو کسو کے کوئي التفات کا

واعظ کہے سو سچ ہے ولے مے فروش سے
ہم ذکر بھی سنا نہیں صوم و صلوت کا

عالم کسو حکیم کا باندھا طلسم ہے
کچھہ ہو تو اعتبار بھی ہو کائنات کا

تجاہل تغافل تساہل کیا — ہوا کام مشکل توکل کیا
نہیں تاب لاتا دل زار اب — بہت ہم نے صبر و تحمل کیا
زمین غزل ملک سی ہو گئی — یہ قطعہ تصرف میں بالکل کیا
حقیقت نہ میرا پنی سمجھی گئی — شب و روز ہم نے تامل کیا

رفتۂ عشق کیا ہوں میں اب کا
جا چکا ہوں جہان سے کب کا

لوگ جب ذکر یار کرتے ہیں
دیکھہ رہتا ہوں دیر منہ سب کا

مست رہتا ہوں جب سے ہوش آیا
میں بھی عاشق ہوں اپنے مشرب کا

دیکھا نہ ادھر ورنہ آتا نہ نظر پھر میں
جی مفت مرا جاتا اُس شوخ کا کیا جاتا

تھا میر بھی دیوانہ پر ساتھہ ظرافت کے
ہم سلسلہ داروں کی زنجیر ہلا جاتا

دل کو گل کہتے تھے درد و غم سے مرجھا یا گیا
جی کو مہماں سنتے تھے مہمان سا آیا گیا

جستجو میں یہ تعب کھینچی کہ آخر ہو گئے
ہم تو کھوئے بھی گئے لیکن نہ کچھہ پایا گیا

مکے گیا مدینے گیا کربلا گیا
جیسا گیا تھا ویسا ہی چل پھر کے آ گیا
دیکھا ہو کچھ اس آمد و شد میں تو میں کہوں
خود گم ہوا ہوں بات کی تہ اب جو پا گیا

خوب کیا جو اہل کرم کے جود کا کچھ نہ خیال کیا
ہم جو فقیر ہوئے تو ہم نے پہلے ترک سوال کیا

بہار آئی چلو چمن میں ہوا کے اوپر بھی رنگ آیا
کہاں تلک گل نہ ہوئے غنچہ رہا موندے منہ سو تنگ آیا
چھلے ہیں موند ہے پہنتی ہے کہنی چسے ہے چولی پھنسے ہے مہری
قیامت اس کی ہے تنگ پوشی ہمارا جی تو بتنگ آیا
وہی ہے رونا وہی ہے کڑھنا وہی ہے شورش جوانی کی سی
بڑھاپا آیا ہے عشق ہی میں پہ میر ہم کو نہ ڈھنگ آیا

نے ہم سے کچھ نہ اُس ستم ایجاد سے ہوا
ظلم صریح عشق کی امداد سے ہوا

دور بہت بھاگو ہو ہم سے سیکھے طریق غزالوں کا
وحشت کرنا شیوہ ہے کچھ اچھی آنکھوں والوں کا

منہ اپنا کبھو وہ ادھر کر رہے گا
ہمیں عشق ہے تو اثر کر رہے گا
جو دلبر ہے ایسا تو دل جا چکا ہے
کسو روز آنکھوں میں گھر کر رہے گا
ہر اک کام موقوف ہے وقت پر ہی
دل خوں شدہ بھی جگر کر رہے گا

سخن مشتاق ہے عالم ہمارا
غنیمت ہے جہاں میں دم ہمارا
رکھے رہتے ہیں دل پر ہاتھ اے میر
یہیں شاید کہ سب ہے غم ہمارا

ہر ورق ہر صفحے میں اک شعر شور انگیز ہے
عرصۂ محشر کا عرصہ ہے میرے دیوان کا

عشق ہمارے خیال پڑا ہے خواب گئی آرام گیا
جی کا جانا ٹھیر رہا ہے صبح گیا یا شام گیا
عشق گیا سر دین گیا ایمان گیا اسلام گیا
دل نے ایسا کام کیا کچھ جس سے میں ناکام گیا
ہائے جوانی کیا کیا کہئے شور سروں میں رکھتے تھے
اب کیا ہے وہ عہد گیا وہ موسم وہ ہنگام گیا

وصل میں رنگ اُڑ گیا میرا
کیا جدائی کو منہ دکھاؤں گا

بعد ہمارے اس فن کا جو کوئی ماہر ہووے گا
درد آگیں انداز کی باتیں اکثر پڑھ پڑھ کر رووے گا
چشم تماشا وا ہووے تو دیکھا بھالی غنیمت ہے
مت موندے آنکھوں کو غافل دیر تلک پھر سووے گا
جست وجو بھی اُس کی کریے جس کا نشاں کچھ پیدا ہو
پانا اس کا میر ہے مشکل جی تو یو نہیں کھووے گا

جب زمزمہ کرتی ہے صدا چبھتی ہے دل میں
بلبل سے کوئی سیکھ لے انداز سخن کا

اُس کی سی جو چلے ہے راہ تو کیا
آسماں پر گیا ہے ماہ تو کیا

کب رخ بدر روشن ایسا ہے
ایک شب کا ہے اشتباہ تو کیا

بے خرد خانقہ میں ہیں گو مست
وہ کرے مست اک نگاہ تو کیا

حسن والے ہیں کج روش سارے
ہوے دو چار رو براہ تو کیا

سر مارنا پتھر سے یا ٹکڑے جگر کرنا
اس عشق کی وادی میں ہر نوع بسر کرنا

دل کے خوں ہونے کا غم کیا اب سے تھا
سینہ کوبی سخت ماتم کب سے تھا

فلک نے پیس کر سرمہ بنایا
نظر میں اُس کی میں تو بھی نہ آیا

زمانے میں مرے شور جنوں نے
قیامت کا سا ہنگامہ اُٹھایا

قریب دیر خضر آیا تھا لیکن
ہمیں رستہ نہ کعبے کا بتایا

حق صحبت نہ طیروں کا رہا یاد
کوئی دو پھول اسیروں تک نہ لایا

موے ہم جس کی خاطر بےوفا تھا
نہ جانا اُن نے تو یوں بھی کہ کیا تھا

معالج کی نہیں تقصیر ہرگز
مرض ہی عاشقی کا لادوا تھا

نہ ملیو چاہنے والوں سے اپنے
نہ جانے تجھہ سے یہ کن نے کہا تھا

پریشاں کرگئی فریاد بلبل
کسو سے دل ہمارا پھر لگا تھا

ملے پرسوں وہی بیگانگی تھی
ہمارے زعم میں وہ آشنا تھا

نہ دیوانے تھے ہم سے قیس وفرہاد
ہمارا طور عشق ان سے جدا تھا

صنم خانے سے اُتھہ کعبے گئے ہم
کوئی آخر ہمارا بھی خدا تھا

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنئے گا
پڑھتے کسو کو سنئے گا تو دیر تلک سر دھنئے گا
سعی و تلاش بہت سی رہیگی اس انداز کے کہنے کی
صحبت میں علما فضلا کی جاکر پڑھئے گنئے گا

سائے میں تاک کے مجھے رکھا اسیر کر
صیاد کے کرم سے قفس آشیاں ہوا
ہم نے نہ دیکھا اُس کو سو نقصان جاں کیا
ان نے جو اک نگاہ کی اُس کا زیاں ہوا
وے تو کھڑے کھڑے مرے گھر آکے پھر گئے
میں بے دیار و بے دل و بے خانماں ہوا

جو تو ہی صنم ہم سے بیزار ہوگا
تو جینا ہمیں اپنا دشوار ہوگا
غم ہجر رکھے گا بیتاب دل کو
ہمیں کڑھتے کڑھتے کچھہ آزار ہوگا

جو افراط اُلفت ہے ایسا تو عاشق
کوئی دن میں برسوں کا بیمار ہوگا
اُچٹتی ملاقات کب تک رہے گی
کبھو تو تہ دل سے بھی یار ہوگا

تجھے دیکھ کر لگ گیا دل نہ جانا
کہ اس سنگدل سے ہمیں پیار ہوگا
یہی ہوگا کیا ہوگا میر ہی نہ ہونگے
جو تو ہوگا بے یار وغمخوار ہوگا

رہے بد حال صوفی حال کرتے دیر مجلس میں
مغنّی سے سنا مصرع جو میرے شعر حالی کا
نظر بھر دیکھتا کوئی تو تم آنکھیں چھپا لیتے
سماں اب یاد ہوگا کب تمہیں وہ خورد سالی کا
چمک یاقوت کی چلتی ہے اتنی دور کاہے کو
اچنبھا ہے نظر بازوں کو ان ہونٹوں کی لالی کا
دماغ اپنا تو اپنی فکرہی میں ہوچکا یکسر
خیال اب کس کو ہے اے ہمنشیں نازک خیالی کا

سخن مشتاق ہے عالم ہمارا
بہت عالم کرے گا غم ہمارا
پڑھیں گے شعر رو رو لوگ بیٹھے
رہے گا دیر تک ماتم ہمارا
نہیں ہے مرجع آدم اگر خاک
کدھر جاتا ہے قد خم ہمارا
زمیں و آسماں زیروزبر ہے
نہیں کم حشر سے ادھم ہمارا
کسو کے بال درہم دیکھتے میر
ہوا ہے کام دل برہم ہمارا

جانا نہ تھا سرھانے مجھہ مختصر کے ھائے
کیا وقت رہ گیا تھا کہ وہ منہ چھپا گیا

آشفتہ سر ھیں سرو گریباں دریدہ گل
بیٹھا کہاں چمن میں کہ فتنہ اُٹھا گیا

گل برگ سے بھرے تھے کہتے تو کنار و جیب
کیا کیا سمیں نہ گریۂ خونیں دکھا گیا

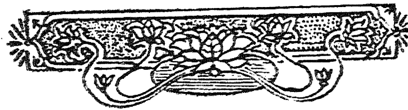
خط بھیج کے بھی شوق کی باتیں چلی گئیں
قاصد کے پیچھے دور تلک میں لگا گیا

روتا ھوں یوں کہ برسے ھے شدت سے جیسے مینھہ
جوں ابر میرے دل پہ غم عشق چھا گیا

ھستی مری کہ ھیچ تھی میں منفعل رھا
اس شرم سے ندان زمیں میں سماں گیا

داغ دل خراب شبوں کو جلے ھے میر
عشق اس خرابے میں بھی چراغ اک جلا گیا

شب کو وہ پئے شراب نکلا — جانا یہ کہ آفتاب نکلا
قربان پیالۂ مے ناب — جس سے کہ ترا حجاب نکلا
مجھہ بن جو پیا تھا قطرہ مے کا — آنکھوں سے ھو خون ناب نکلا
مستی میں شراب کی جو دیکھا — عالم یہ تمام خواب نکلا
شیخ آتے تو میکدے میں آیا — پر ھو کے بہت خراب نکلا
یک جرعۂ شراب ھی میں واعظ — ھر مسخرگی کا باب نکلا
تھا غیرت بادہ عکس گل سے — جس جوے چمن سے آب نکلا



ردیف ب

شکوہ عبث ہے میر کہ کڑھتے ہیں سارے دن
یا دل کا حال رہتا ہے درہم تمام شب
گزارا کسے جہاں میں خوشی سے تمام روز
کس کی کٹتی زمانے میں بے غم تمام شب

مت ڈھلک مژگاں سے اب تو اے سرشک آبدار
مفت میں جاتی رہے گی تیری موتی کی سی آب
کچھہ نہیں بحر جہاں کی موج پر مت بھول میر
دور سے دریا نظر آتا ہے لیکن ہے سراب

زردی رنگ ہے غم پوشیدہ پر دلیل
دل میں جو کچھہ ہے منہ سے ہمارے عیاں ہے اب
برسوں ہوئے گئے اُسے پر بھولتا نہیں
یادش بخیر میر رہے خوش جہاں ہے اب

طاقت کہ جس سے تاب جفا تھی سو ہو چکی
تھوڑی سی کوفت میں بھی بہت سا تعب ہے اب
نے چاہ وہ اسے ہے نہ مجھہ کو ہے وہ دماغ
جانا مرا اُدھر کو بشرط طلب ہے اب

ناسازی طبیعت ایسی کہ اُس کے اوپر
ہے ہر کسو سے مجھہ کو ناچار ساز واجب

اس عمر برق جلوہ کی فرصت بہت ہے کم
جو کام پیش آوے تجھے اس میں ہو شتاب

غفلت سے یہ غرور تجھے ورنہ ہے بھی کچھہ
یاں وہ سماں ہے جیسے کہ دیکھے ہے کوئی خواب

یہ بستیاں اُجڑ کے کہیں بستیاں بھی ہیں
دل ہو گیا خراب جہاں، پھر رہا خراب

کاش اُس کے روبرو نہ کریں مجھہ کو حشر میں
کتنے مرے سوال ہیں جن کا نہیں جواب

مسکن جہاں تھا دل زدہ مسکیں کا ہم توواں
کل دیر میر میر پکارے نہیں ہے اب

دنیا میں حسن و خوبی میر اک عجیب شے ہے
رندان و پارساہاں جس پر رکھیں نظر سب

یارب کدھر گئے وے جو آدمی روش تھے
اوجڑ دکھائی دے ہیں شہرو دہ ونگر سب

حرف و سخن سے مطلق یاں گفتگو نہیں ہے
پیادے سوار ہم کو آئے نظر نفر سب

عالم کے لوگوں کا ہے تصویر کا سا عالم
ظاہر کھلی ہیں آنکھیں لیکن ہیں بے خبر سب

میر اس خرابے میں کیا آباد ہووے کوئی
دیوار ودر گرے ہیں ویران پڑے ہیں گھر سب

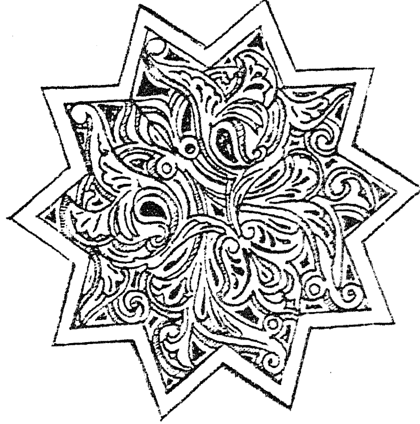
شب ہاے تار و تیرہ زمانے میں دن ہوئے
شب ہجر کی بھی ہووے سحر تو ہے کیا عجب

جاتے ہے چشم شوخ کسو کی ہزار جا
آوے اِدھر بھی اُس کی نظر تو ہے کیا عجب

آیا ہے شوب سر پہ گیا ہے شباب اب
کرنا جو کچھہ ہو تم کو سو کرلو شتاب اب

بگڑا بنا ہوں عشق سے سو بار عاقبت
پایا قرار یہ کہ رہوں میں خراب اب

خوں ریزی عاشقوں کی ہے ظالم اگر ثواب
تو تو ہوا ہے تجھہ کو بہت سا ثواب اب



ردیف ت

ہر جنس کے خواهاں ملے بازار جہاں میں
لیکن نہ ملا کوئی خریدار محبت
اس راز کو رکھہ جی هی میں تا جی بچے تیرا
زنہار جو کرتا هو تو اظہار محبت

اب تو چپ لگ گئی هے حسرت سے
پهر کهلے گی زبان جب کی بات
نکتہ دان رفتہ کی نہ کہو
بات وہ هے جو هووے اب کی بات
کس کا روے سخن نہیں اودهر
هے نظر میں هماری سب کی بات
ظلم هے قہر هے قیامت هے
غصے میں اُس کے زیر لب کی بات
کہتے هیں آگے تها بتوں میں رحم
هے خدا جانئے یہ کب کی بات
گو کہ آتش زباں تهے آگے میر
اب کی کہئے گئی وہ تب کی بات

دیر کچهہ کهچتی تو کہتے بهی ملاقات کی بات
ملنا جو اپنا هوا اُس سے سو وہ هو بات کی بات
گفتگو شاهد و مے سے هے نہ غیبت نہ گلہ
خانقہ کی سی نہیں بات خرابات کی بات

هوتی هے گرچہ کہنے سے یارو پرائی بات
پر هم سے تو تهمی نہ کبهو منہ پر آئی بات

کہتے تھے اس سے ملئے تو کیا کیا نہ کہئے لیک
وہ آگیا تو سامنے اُس کے نہ آئی بات

اب تو ہوے ہیں ہم بھی ترے ڈھب سے آشنا
واں تو نے کچھہ کہا کہ ادھر ہم نے پائی بات

بلبل کے بولنے میں سب انداز ہیں مرے
پوشیدہ کب رہی ہے کسو کی اُڑائی بات

عالم سیاہ خانہ ہے کس کا کہ روز و شب
یہ شور ہے کہ دیتی نہیں کچھہ سنائی بات

اِک دن کہا تھا یہ کہ خموشی میں ہے وقار
سو مجھہ سے ہی سخن نہیں میں جو بتائی بات

اب مجھہ ضعیف و زار کو مت کچھہ کہا کرو
جاتی نہیں ہے مجھہ سے کسو کی اُٹھائی بات

ملامت گر نہ مجھہ کو کر ملامت
جلے کو اور تو اتنا جلا مت

تری نا آشنائی کے ہیں بندے
نہ وہ اب ربط نے صاحب سلامت

بہت رونے نے رسوا کر دکھایا
نہ چاہت کی چھپی ہم سے علامت

شعر کے پردے میں میں نے غم سنایا ہے بہت
مرثیے نے دل کے میرے بھی رلایا ہے بہت

وادی و کہسار میں روتا ہوں ڈاڑھیں مار مار
دلبران شہر نے مجھکو ستایا ہے بہت

وا نہیں ہوتا کسی سے دل گرفتہ عشق کا
ظاہرا غمگیں اُسے رہنا خوش آیا ہے بہت

مت اِن نمازیوں کو خانہ ساز دیں جانو
کہ ایک اینٹ کی خاطر یہ ڈھاتے ہیں گے مسیت

غم زمانہ سے فارغ ہیں مایہ باختگاں
قمار خانۂ آفاق میں ہے ہار بھی جیت

مجھہ بے نوا کی یاد رہے میر یہ صدا
اس میکدے میں رہیو بہت ہوشیار دوست

پھول گل شمس و قمر سارے ہی تھے
پر ہمیں اِن میں تمہیں بھائے بہت

میر سے پوچھا جو میں عاشق ہو تم
ہو کے کچھہ چپکے سے شرمائے بہت

کوشش اپنی تھی عبث پر کی بہت
کیا کریں ہم چاہتا تھا جی بہت

ہمیں عشق میں میر چپ لگ گئی ہے
نہ شکر و شکایت نہ حرف و حکایت

چشم رہنے لگی پر آب بہت
شاید آوے گا خون ناب بہت

دیر و کعبے میں اُس کے خواہش مند
ہوتے پھرتے ہیں ہم خراب بہت

دل کے دل ہی میں رہ گئے ارماں
کم رہا موسم شباب بہت

مارنا عاشقوں کا گر ہے ثواب
تو ہوا ہے تمہیں ثواب بہت

تھی بحر کی سی لہر کہ آئی چلی گئی
پہنچی ہے اس سرے تئیں طبع رواں کی بات
اب تو وفا و مہر کا مذکور ہی نہیں
تم کس سمیں کی کہتے ہو ہے یہ کہاں کی بات

منہ پہ رکھتا ہے وہ نقاب بہت
ہم سے کرتا ہے وہ حجاب بہت
چشمک، گل کا لطف بھی نہ اُٹھا
کم رہا موسم شباب بہت

ڈھونڈتے اُس کو کوچے پھرے
دل نے ہم کو کیا خراب بہت
چلنا اپنا قریب ہے شاید
جاں کرے ہے اب اضطراب بہت
اس غصیلے سے کیا کسو کی نبھے
مہربانی ہے کم عتاب بہت

کب آوے گا کیا جانے وہ سرو قامت
ہمارے تو سر پر ابھی ہے قیامت
نماز سفر ہے اشارت اسی سے
کہ تھوڑا بہت یاں ہے وقت اقامت

رہا رابطہ غارت دل تلک بس
نہیں اب تو بندے سے صاحب سلامت
گریباں کو گل چاک کرنے لگیں گے
کھلے رکھہ گلستاں میں بند قبامت

اُٹھا کر نہ یک زخم شمشیر اس کا
غزال حرم نے اُٹھائی ملامت
بگڑتی ہے صورت علاقے سے دل کے
کسو نے وفا سے دل اپنا لگا مت

کوئی فصل گل میں بھی توبہ کرے ہے
رہے گی ہمیں دیر اس کی ندامت

کہیں دل کی لاگیں لگیں چھتیاں ہیں
کہ چہرے کی زردی بڑی ہے علامت

گئے سو گئے پیشتر۔ تھی جوانی
رہ عشق میں میر آئندہ جا مت

یاد ایامے کہ ہنگامہ رہا کرتا تھا رات
شور و شر سے میرے اک فتنہ رہا کرتا تھا رات

کام کیا تھا جیب و دامن سے مجھے پیش از جنوں
سینہ چاکی اپنی میں بیٹھا کیا کرتا تھا رات

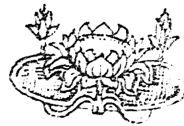
جن دنوں کھینچا تھا سر اُس بادشاہ حسن نے
ہر گلی میں اک فقیر اُس کی دعا کرتا تھا رات

اب جہاں کچھہ بات چھیڑی سوچ لایا۔ پیش ازیں
میں کہا کرتا غم دل وہ سنا کرتا تھا رات

ہجر میں کیا کیا سمیں دیکھے ہیں ان آنکھوں سے میں
زرد رخ پر لالہ گوں آنسو بہا کرتا تھا رات

بعد میرے اس غزل پر بھی بہت رووینگے لوگ
میں بھی ہر ہر بیت پر اس کے بکا کرتا تھا رات

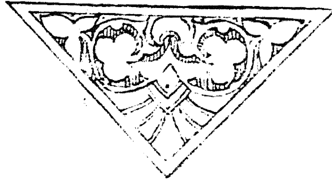
دیکھہ خالی جا کہیں گے برسوں اہل روزگار
میر اکثر دل کا قصہ یاں کہا کرتا تھا رات



ردیف ج

ساقی تک ایک موسم گل کی طرف بھی دیکھہ
ٹپکا پڑے ھے رنگ چمن میں ھوا سے آج

شیشہ صراحی ساغر مینا سب کل تک بھی حاضر تھے
کوے بادہ فروشاں میں یہ میری حرمت کیا ھے آج



ردیف چ

عشق میں اے طبیب ہاں تک سوچ
پائے جاں درمیاں ہے یاں، تک سوچ

سرسری مت جہاں سے جا غافل
پاؤں تیرا پڑے جہاں، تک سوچ

پھیل اتنا پڑا ہے کیوں تو یاں
یار اگلے گئے کہاں، تک سوچ

ہونٹ اپنا ہلا نہ سمجھے بن
یعنی جب کھولے تو زباں، تک سوچ

گل و رنگ و بہار پردے ہیں
ہر عیاں میں ہے وہ نہاں، تک سوچ

فائدہ سرجھکے کا شیب میں میر
پیری سے آگے اے جواں تک سوچ

ایک ہوویں جو زباں و دل توکچھ نکلے بھی کام
یوں اثر اے میر کیا ہو گریہ وزاری کے بیچ

اے بوئے گل سمجھ کے مہکیو پون کے بیچ
زخمی پڑے ہیں مرغ ہزاروں چمن کے بیچ

منتظر برسوں رہے افسوس آخر مرگئے
دیدنی تھے لوگ اس ظالم کے بیماروں کے بیچ

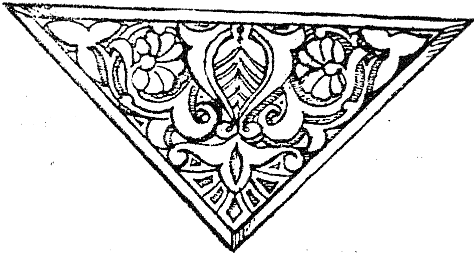
دل یہی ہے جس کو دل کہتے ہیں اس عالم کے بیچ
کاش یہ آفت نہ ہوتی قالب آدم کے بیچ
رونق آبادی ملک سخن ہے اُس تلک
ہوں ہزاروں دم الٰہی میر کے اک دم کے بیچ

ردیف ح

جوں سبزہ چل چمن میں لب جو پہ سیر کر
عمر عزیز جاتی ہے آب رواں کی طرح

جوں سقف بے عمد ہو، نہیں اس کا اعتماد
کس خانماں خراب نے کی آسماں کی طرح

یوسف کی اس نظیر سے دل کو نہ جمع رکھ
ایسی متاع جاتی ہے بازار ہر طرح



ردیف د

مرے سنگ مزار پر فرہاد رکھہ کے تیشہ کہے ہے یا اُستاد

فکر تعمیر میں نہ رہ منعم زندگانی کی کچھہ بھی ہے بنیاد

خاک بھی سر پہ ڈالنے کو نہیں کس خرابے میں ہم ہوئے آباد

سنتے ہو تک سنو کہ پھر مجھہ بعد نہ سنو گے یہ نالہ و فریاد

ہرطرف ہیں اسیر ہم آواز باغ ہے گھر ترا تو اے صیاد

ہم کو مرنا یہ ہے کہ کب ہوں کہیں اپنی قید حیات سے آزاد

ہمیں اسیر تو ہونا ہے اپنا اچھا یاد
کشش نہ دام کی دیکھہ نہ کوشش صیاد

نہ دردمندی سے یہ راہ تم چلے ورنہ
قدم قدم پہ تھی یاں جائے نالہ وفریاد

ثبات قصرو در و بام وخشت و گل کتنا
عمارت دل درویش کی رکھو بنیاد

چمن میں یار ہمیں لے گئے تھے وا نہ ہوئے
ہمارے ساتھہ یہی غم یہی دل ناشاد

تن کو جس جاگہ سے چھیڑوں ہوں وہاں ہے درد درد
ہاتھہ لگتے دل کے ہو جاتا ہوں کچھہ میں زرد زرد
اب تو وہ حسرت سے آہ و نالہ بھی کرنا گیا
کوئی دم ہونٹوں تک آجاتا ہے گاہے سرد سرد

کم ناز سے ہے کس کے بندے کی بے نیازی
تالب میں خاک کے یاں پنہا خدا ہے شاید

ہے عشق کا فسانہ میرا یاں زباں زد
ہر شہر میں ہوئی ہے یہ داستاں زباں زد

حسرت سے حسن گل کے چپکا ہوا ہوں ورنہ
طیران باغ میں ہوں خوش زباں زباں زد

مذکور عاشقی کا ہر چارسو ہے باہم
یعنی نہیں کہانی میری کہاں زباں زد

فرہاد قیس و وامق ہر یک سے پوچھ لو تم
شہروں میں عشق کے ہوں میں نا تواں زباں زد

کیا جانے میر کس کے غم سے ہے چپ وگرنہ
حرف وسخن میں کیا ہی ہے یہ جواں زباں زد

کچھ ہوش نہ تھا منبر و محراب کا ہم کو
صد شکر کہ مسجد میں ہوئے مستی میں وارد

عمر عزیز ساری منت ہی کرتے گزری
بے جرم آہ رہئے یوں عذر خواہ تا چند

یاں ناز و سرکشی سے کیا دیکھنا نہیں ہے
کج اس چمن میں ٹھیرے گل کی کلاہ تا چند

نہیں خوں بستگی سے چشم تر بند
جراحت نے کئے ہیں چشم پر بند

گیا ہے وہ سو دل کھلتا نہیں ہے
پڑا ہے ایک مدت سے یہ گھر بند

گئے دن تکتکی کے باندھنے کے
اب آنکھیں رہتی ہیں دو دو پہر بند

ہمیں منظور ہر صورت میں ہے دید
کھلی ہو چشم جوں آئینہ یا بند



ردیف ر

قدم دشت محبت میں نہ رکھہ میر
کہ سر جاتا ھے گام اولیں پر

میر صاحب زمانہ نازک ھے
دونوں ھاتھوں سے تھامئے دستار
سہل سی زندگی پہ کام کے تئیں
اپنے اوپر نہ کیجئے دشوار
چاردن کا ھے مجہلہ یہ سب
سب سے رکھئے سلوک ھی ناچار
وھاں جہاں خاک کے برابر ھے
قدر ہفت آسمان ظلم شعار
یہی درخواست پاس دل کی ھے
نہیں روزہ نماز کچھہ درکار
درمسجد پہ حلقہ‌زن ھو تم
کہ رھو بیٹھہ خانۂ خمار ق
جی میں آوے سو کیجیو پیارے
ایک ھو جو نہ درپئے آزار
حاصل دو جہاں ھے یک حرف
ھو مری جان آگے تم مختار

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ھو سکے
پچھتاؤگے سنو ھو یہ بستی اُجاڑ کر
یارب رہ طلب میں کوئی کب تلک پھرے
تسکین دے کہ بیٹھہ رھوں پانوں گاڑ کر
غالب کہ دیوے قوت دل اس ضعیف کو
تنکے کو جو دکھاوے ھے پل میں پہاڑ کر

کچھ بھی
وے آسمـ
پست و بلند یاں
اپنی نظر نہیں ہے
قصر چنا
شاید نہ
یاں خاک سے اُٹھو
آثار ہیں جنھوں کے

اے صباگر شہر کے لوگوں
کہیو ہم صحرا نوردوں
خاک دھلی
کو
آسماں
منصب بلبل غزل خوانی
شاعری زاغ و زغن کا ہو
طائر خوش ز
چہچہے چڑیار
برگ گل سے بھی کیا نہ ایک
نامہ و پیغام و پرسش بے
بے خلش کیوں
میں قفس میں ہے
بلبل خوش لہجہ کی جائے
طرح غوغا کی چمن میں ڈال
طائران خوش ا
شور سے اُن کے
شہر کے کیا ایک دو کوچوں میں
شہروں شہروں ملکوں ملکوں ہے

نہ کہئے میر
ر دیکھکر

سورۂ جہاں کو
صورتیں بگڑ کر

طلسم جہاں
ہے کچھ اور

کی مت جاؤ
ہے کچھ اور

کہتے ہیں
خاطر مور

جا
کار
کیجو نرگس
ار آخر کار

اول کار محبت تو بہت سہل ہے میر
جی سے جاتا ہے ولے صبر و قرار آخر کار

مرگ اِک ماندگی کا وقفہ ہے یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

وے لوگ تم نے ایک ہی شوخی میں کھو دئے
پیدا کئے تھے چرخ نے جو خاک چھان کر

حاصل بجز کدورت اس خاکداں سے کیا ہے
خوش وہ کہ اُتھہ گئے ہیں داماں جھٹک جھٹک کر
یہ مشت خاک یعنی انسان ہی ہے روکش
ورنہ اُتھائی کن نے اس آسماں کی ٹکر
منزل کی میر اُس کی کب راہ تجھہ سے نکلے
یاں خضر سے ہزاروں مر مر گئے بھٹک کر

حال کہہ چپ رہا تو میں بولا
کس کا قصہ تھا ہاں کہے جا میر

رفتار میں یہ شوخی رحم اے جواں زمیں پر
لاتا ہے تازہ آفت تو ہر زماں زمیں پر
آنکھیں لگی رہیں گی برسوں وہیں سبھوں کی
ہوگا قدم کا تیرے جس جانشاں زمیں پر
آتا نہ تھا فرو سر جن کا کل آسماں سے
ہیں ٹھوکروں میں اُن کے آج استخواں زمیں پر
جو کوئی یاں سے گزرا کیا آپ سے نہ گزرا
پانی رہا کب اتنا ہو کر رواں زمیں پر
پھر بھی اُتھائی سر پر تم نے زمیں سب آکر
کیا کیا ہوا تھا تم سے کچھہ آگے یاں زمیں پر

کچھ بھی مناسبت ہے یاں عجز واں تکبر
وے آسمان پر ہیں میں نا تواں زمیں پر
پست و بلند یاں کا ہے اور ہی طرف سے
اپنی نظر نہیں ہے کچھ آسماں زمیں پر
قصر جناں تو ہم نے دیکھا نہیں جو کہئے
شاید نہ ہووے دل سا کوئی مکاں زمیں پر
یاں خاک سے اُنہوں کے لوگوں نے گھر بنائے
آثار ہیں جنہوں کے اب تک عیاں زمیں پر

اے صبا گر شہر کے لوگوں میں ہو تیرا گزار
کہیو ہم صحرا نوردوں کا تمامی حال زار
خاک دہلی سے جدا ہم کو کیا یکبار گی
آسماں کو تھی کدورت سو نکالا یوں غبار
منصب بلبل غزل خوانی تھا سو وہ ہے اسیر
شاعری زاغ و زغن کا ہو نہ ہووے اب شعار
طائر خوش زمزمہ کنج قفس میں ہے خموش
چہچہے چڑیاں کریں ہیں صحن گلشن میں ہزار
برگ گل سے بھی کیا نہ ایک نے تک ہم کو یاد
نامہ و پیغام و پرسش بے مراتب درکنار
بے خلش کیوں کر نہ ہو گرم سخن گلزار میں
میں قفس میں ہوں کہ میرا تھا دلوں میں اُن کے خار
بلبل خوش لہجہ کی جائے پہ گو غوغائیاں
طرح غوغا کی چمن میں ڈالیں پر کیا اعتبار
طائران خوش لب و لہجہ نہیں رہتے چھپے
شور سے اُن کے بھرے ہیں قریہ وشہر و دیار
شہر کے کیا ایک دو کوچوں میں تھی شہرت رہی
شہروں شہروں ملکوں ملکوں ہے اُنہوں کا اشتہار

کیا کہوں سوئے چمن ہوتا جو میں سرگرم گشت
پھول گل جب کھلنے لگتے جوش زن ہوتی بہار

شور سن سن کر غزل خوانی کا میری ہم صفیر
غنچہ ہو آتے جو ہوتا آب و رنگ شاخسار

خوش نوائی کا جنھیں دعویٰ تھا رہ جاتے خموش
جن کو میں کرتا مخاطب اُن کو ہوتا افتخار

بعضوں کو رشک قبول خاطر و لطف سخن
بعضوں کا سینہ فگار اور بعضوں کا دل داغدار

ایک کے ہونٹھوں کے اوپر آفریں اُستاد تھا
ایک کہتے تھے رسوخ دل ہے اپنا استوار

ربط کا دعویٰ تھا جن کو کہتے تھے مخلص ہیں ہم
جانتے ہیں ذات سامی ہی کو ہم سب خاکسار

نقل کرتے کیا یہ صحبت منعقد جب ہوتی بزم
بیٹھ کر کہتے تھے منہ پر میرے بعضے بعضے یار

بندگی ہے خدمت عالی میں ہم کو دیر سے
کر رکھی ہے جان اپنی ہم نے حضرت پر نثار

سو نہ خط اُن کا نہ کوئی پرچہ پہنچا مجھ تلک
واہ واہے رابطہ رحمت ہے یہ اخلاص و پیار

رفتہ رفتہ ہوگئیں آنکھیں بھی اب میری سفید
بس کہ نامے کا کیا یاروں کے میں نے انتظار

لکھتے گر دو حرف لطف آمیز بعد از چند روز
تو بھی ہوتا اس دل بیتاب و طاقت کو قرار

سو تو اک نبوشتہ کاغذ بھی نہ آیا میرے پاس
اِن ہم آوازوں سے جن کا میں کیا ربط آشکار

خط کتابت سے یہ کہتے تھے نہ بھولیں گے تجھے
آویں گے گھر بار کی تیرے خبر کو بار بار

جب گیا میں یاد سے تب کس کا گھر کا ہے کا پاس
آفریں صد آفریں اے مردمان روزگار

اب بیاباں در بیاباں ہے مرا شور و فغاں
گو چمن میں خوش کی تم نے میری جائے نالہ وار
ہے مثل مشہور یہ عمر سفر کوتاہ ہے
طالع برگشتہ بھی کرتے ہیں اب امداد کار
اک پر افشانی میں بھی ہے یہ وطن گلزار سا
سامعوں کی چھاتیاں نالوں سے ہوویں گی فگار
منہ پر آویں گے سخن آلودۂ خون جگر
کیوں کہ یاران زماں سے چاک ہے دل جوں انار
لب سے لے کر تا سخن ہیں خونچکاں شکوے بھرے
لیک ہے اظہار ہر ناکس سے اپنا ننگ و عار
چپ بھلی گو تلخ کامی کھینچنی اس میں پڑی
بیت بحثی طبع نازک پر ہے اپنی ناگوار
آج سے کچھ بے حسابی جو رکن مردم نہیں
ان سے اہل دل سدا کھینچے ہیں رنج بیشمار
بس قلم رکھ ہاتھ سے جانے بھی دے یہ حرف میر
کاہ کے چاہے نہیں کہسار ہوتے بے وقار
کام کے جو لوگ صاحب فن ہیں سو محسود ہیں
بے تہی کرتے رہیں گے حاسدان نابکار

کچھ ہو رہے گا عشق و ہوس میں بھی امتیاز
آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر
پہنچا نہ اس کی داد کو مجلس میں کوئی رات
مارا بہت پتنگ نے سر شمعدان پر
تھوڑے میں دور کھینچے ہے کیا آدم آپ کو
اس مشت خاک کا ہے دماغ آسمان پر

فرصت سے اس چمن کی کل رو کے میں جو پوچھا
چشمک کی ایک گل نے میری طرف کو ہنس کر

اس قافلے میں کوئی دل آشنا نہیں ھے
ٹکرے گلے کے اپنے ناحق نہ اے جرس کر

صیاد اگر اجازت گلگشت کی نہیں تک
دیوار باغ کو تو بارے در قفس کر

صورت پرست ہوتے نہیں معنی آشنا
ھے عشق سے بتوں کے مرا مدعا کچھہ اور

مرنے پہ جان دیتے ھیں وارفتگان عشق
ھے میر راہ ورسم دیار وفا کچھہ اور

چمکے ھے جب سے برق سحر گلستاں کے اور
جی لگ رھا ھے خار و خس آشیاں کے اور

یاں تاب سعی کس کو جذب عشق کا
لاوے اسی کو کھینچ کسو ناتواں کے اور

یا دل وہ دیدنی تھی جگہ یا کہ تجھہ بغیر
اب دیکھتا نہیں ھے کوئی اس مکاں کے اور

مذھب سے میرے کیا تجھے میرا دیار اور
میں اور یار اور میرا کار و بار اور

بندے کو ان فقیروں میں گنئے نہ شہر کے
صاحب نے میرے مجھہ کو دیا اعتبار اور

سعی و طلب بہت کی مطلب کے تئیں نہ پہنچے
ناچار اب جہاں سے بیٹھے ھیں ھاتھہ اٹھا کر

ارمان ھے جنھوں کو وے اب کریں محبت
ھم تو ھوے پشیماں دل کے تئیں لگا کر

سحر گوش گل میں کہا میں نے جا کر
کھلے بند مرغ چمن سے ملا کر
لگا کہنے فرصت ہے یاں اک تبسم
سو وہ بھی گریباں میں منہ چھپا کر

تنا سب پر اعضا کی اتنا تبختر
بگاڑا تجھے خوب صورت بنا کر
قیامت رہا اضطراب اُن کے غم میں
جگو پھر گیا رات ہونٹوں پہ آکر
مبارک تمھیں میر ہو عشق کرنا
بہت ہم تو پچتائے کو دل لگا کر

اے مرغ چمن صبح ہوئی زمزمہ سر کر
دم کھینچ نہ دل سے کوئی ٹکڑے جگر کر
ہے بے خبری مجھکو ترے دیکھے سے ساقی
ہر لحظہ مری جان مجھے میری خبر کر
پڑتے نگہ اُس شوخ کی ہوتا ہے یہ احوال
رہ جاوے ہے جیسے کہ کوئی بجلی سے ڈر کر
معشوق کا کیا وصل ورے ایسا دھرا ہے
تا شمع پتنگا بھی جو پہنچے ہے تو مر کر
جس جائے سراپا میں نظر جاتی ہے اُس کی
آتا ہے مرے جی میں یہیں عمر بسر کر
کسب اور کیا ہوتا عوض ریختہ کے کاش
پچتائے بہت میر ہم اس کام کو کر کر

مت اس چمن میں غنچہ روش بود باش کر
مانند گل شگفتہ جبیں یاں معاش کر

دل رکھہ توی فلک کی زبردستی پر نہ جا
گر کشتی لگ گئی ھے تو تو بھی تلاش کر
ھے کیا تو جیسے غنچہ بندھی متھی جا چلا
مت گل کے رنگ منہ کو کھلا راز فاش کر

عشق محبت یاری میں اک لطف رکھے ھے کرنا ضبط
چھاتی پر جو ھو کوہ الم کا تو بھی نالہ و آہ نہ کر
مانگ پناہ خدا سے بندے دل لگنا اک آفت ھے
عشق نہ کر زنہار نہ کر واللہ نہ کر باللہ نہ کر

کیا جانئے کہ دل پر گزرے ھے میر کیا کیا
کرتا ھے بات کوئی آنکھیں پر آب کر کر
سن سن کے درد دل کو بولا کہ جاتے ھیں ھم
تو اپنی یہ کہانی بیٹھا ھوا کہا کر
آگے زمیں کی تہ میں ھم سے بہت تھے تو بھی
سر پر زمیں اُتھائی ھم ہے تہوں نے آکر

بزم میں منہ ادھر کویں کیوں کر
اور نیچی نظر کریں کیوں کر
یوں بھی مشکل ھے ووں بھی مشکل ھے
سر جھکائے گزر کریں کیوں کر
مہ فلک پر ھے وہ زمیں پر آہ
ان کو زیر و زبر کریں کیوں کر
دل نہیں درد مند اپنا میر
آہ و نالے اثر کریں کیوں کر

گرچہ انسان ھیں زمیں سے ولے
ھیں دماغ ان کے آسمانوں پر

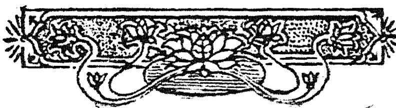
عرش و دل دونوں کا ہے پایہ ہے بلند
سیر ہستی ہے ان مکانوں پر
قصے دنیا میں میر بہت سنے
نہ رکھو گوش ان افسانوں پر

سوتے نہ لگ چل اس سے اے باد تونے ظالم
بہتیروں کو سلایا اس کو جگا جگا کر
یوسف عزیز دلہا جا مصر میں ہوا تھا
ذلت جو ہو وطن میں تو کوئی دن سفر کر
کیا حال زار عاشق کیجئے بیاں نہ پوچھو
کرتا ہے بات کوئی دل کی تو چشم تر کر

اقرار میں کہاں ہے انکار کی سی خوبی
ہوتا ہے شوق غالب اُس کی نہیں نہیں پر
کنج قفس میں جوں توں کاٹینگے ہم اسیراں
سیر چمن کے شایاں اپنے رہے نہیں پر
غصے میں عالم اس کا کیا کیا نظر پڑا ہے
تلواریں کھنچتیاں تھیں اس کی جبیں کی چیں پر

کہتا ہے کون تجھکو یاں یہ نہ کر تو وہ کر
پر ہو سکے تو پیارے دل میں بھی ٹک جگہ کر

مرتے ہیں میر سب پہ نہ اس بیکسی کے ساتھ
ماتم میں تیرے کوئی نہ رویا پکار کر



ردیف س

حرماں تو دیکھہ پھول بکھیرے تھی کل صبا
اک برگ گل گرا نہ، جہاں تھا مرا قفس
اے گریہ اُس کے دل میں اثر خوب ھی کیا
روتا ھوں جب میں سامنے اُس کے تو دے ھے ھنس

دردمندوں سے تمھیں دور پھرا کرتے ھو کچھہ
پوچھنے ورنہ سبھی آتے ھیں بیمار کے پاس
داغ ھوتا نظر آتا ھے دلوں کا آخر
یہ جو اک خال پڑا ھے ترے رخسار کے پاس
کیا رکھا کرتے ھو آئینے سے خلوت ھر دم
تک کبھو بیٹھو کسو طالب دیدار کے پاس

———:o:———

ردیف ش

شب اس دل گرفتہ کو وا کر بزور مے
بیٹھے تھے شیرہ خانے میں ھم کتنے ھرزہ کوش
آئی صدا کہ یاد کرو دور رفتہ کو
عبرت بھی ھے ضرور تک اے جمع تیز ھوش
جمشید جن نے وضع کیا جام کیا ھوا
وے صحبتیں کہاں گئیں کیدھر وے نا و نوش
جز لالہ اس کے جام سے پاتے نہیں نشاں
ھے کوکنار اس کی جگہ اب سبو بدوش
جھومے ھیں بید جاے جوانان مے گسار
بالاے خم ھے خشت سر پیر مے فروش

میر اس غزل کو خوب کہا تھا ضمیر نے
پر اے زباں دراز بہت ہو چکی خموش

گل کو ہوتا صبا قرار اے کاش
رہتی اک آدہ دن بہار اے کاش
اِس میں راہ سخن نکلتی تھی
شعر ہوتا ترا شعار اے کاش

شش جہت اب تو تنگ ہے ہم پر
اس سے ہوتے نہ ہم دوچار اے کاش
بے اجل میر اب پڑا مرنا
عشق کرتے نہ اختیار اے کاش

کیا کہئے کیا رکھیں ہیں ہم تجھہ سے یار خواہش
یک جان و صد تمنا یک دل ہزار خواہش
لے ہاتھوں میں قفس تک صیاد چل چمن میں
مدت سے ہے ہمیں بھی سیر بہار خواہش

نے کچھہ گنہ ہے دل کا نے جرم چشم اس میں
رکھتی ہے ہم کو اتنا بے اختیار خواہش
حالانکہ عمر ساری مایوس گزری تسپر
کیا کیا رکھیں ہیں اُس کے اُمیدوار خواہش

بتوں کے غم میں نالاں جب نہ تب ہوں
نہ راضی خلق مجھہ سے نے خدا خوش
رہا پھولوں میں کرتا زمزمہ میں
مری اس باغ میں گزری سدا خوش

کیا پتنگے کو شمع روئے میر
اس کی شب کو بھی ھے سحر درپیش

——:o:——

ردیف ظ

جو وہ ھے تو ھے زندگانی سے حظ
مزا عمر کا ھے جوانی سے حظ

نہیں وہ تو سب کچھہ یہ بے لطف ھے
نہ کھانے سے لذت نہ پانی سے حظ

کہا درد دل رات کیا میر نے
اُٹھاتے بہت اس کہانی سے حظ

——:o:——

ردیف ف

جو دیکھو مرے شعر تر کی طرف
تو مائل نہو پھر گہر کی طرف

محبت نے شاید کہ دی دل کو آگ
دھواں سا ھے کچھہ اس نگر کی طرف

نظر کیا کروں اس کے گھر کی طرف
نگاھیں ھیں میری نظر کی طرف

چھپاتے ھیں منہ اپنا کامل سے سب
نہیں کوئی کرتا ھنر کی طرف

بڑی دھوم سے ابر آئے گئے
نہ کوئی ھوا چشم تر کی طرف

اندھا دھند روتے ھیں آنکھوں سے خوں
نہیں دیکھتے ھم جگر کی طرف

رہا ہے خبر گرچہ ہجراں میں میر
رہے گوش اس کی خبر کی طرف

نظر کیوں گئی رو و مو کی طرف
کھنچا جاے ہے دل کسو کی طرف
نہ دیکھو کبھو موتیوں کی لڑی
جو دیکھو مری گفتگو کی طرف
اُسے ڈھونڈتے میر کھوئے گئے
کوئی دیکھے اس جستجو کی طرف

اے تجھہ بغیر لالہ و باغ و بہار حیف
گل سے چمن بھریں ہوں نہ ہو تو ہزار حیف

———;o;———

ردیف ق

میر جی زرد ہوتے جاتے ہو
کیا کہیں تم نے بھی کیا ہے عشق

———:o:———

ردیف ک

کچھہ ہو اے مرغ قفس لطف نہ جائے اس سے
نوحہ یا نالہ ہراک بات کا انداز ہے ایک
ناتوانی ہے، نہیں بال فشانی کا دماغ
ورنہ تا باغ قفس سے مري پرواز ہے ایک
گوش کو ہوش کے تک کھول کے سن شور جہاں
سب کی آواز کے پردے میں سخن ساز ہے ایک

چاهے جس شکل سے تمثال صفت اُس میں درا
عالم آئینے کے مانند در باز هے ایک

کچھه اپنی آنکهه میں آیا نه یاں کا
خزف سے لیکے دیکھا در تر تک

جسے شب آگ سا دیکھا سلگتے
اُسے پھر خاک هی پایا سحر تک

حال میرا شہر میں کہتے رهیں گے لوگ دیر
اس فسانے کے تئیں هونے تودو مشہور تک

پشت پا مارے هے شاهی پر گدائے کوے عشق
دیکھو تم یاں کا خدا کے واسطے دستور تک

رهے هے غش و درد دودو پہر تک
سر زخم پہنچا هے شاید جگر تک

هوے هیں حواس اور هوش وخرد گم
خبر کچھه تو آئی هے اس بے خبر تک

بہار آئی پر ایک پتی بھی گل کی
نه آئی اسیران بے بال و پر تک

بہت میر برهم جہاں میں رهیں گے
اگر رہ گئے آج کی شب سحر تک

وہ تو نہیں که اودهم رهتا تها آشیاں تک
آشوب ناله اب تو پہنچا هے آسماں تک

هجراں کے سختیوں سے پتھر دل جگر هیں
صبر اس کی عاشقی میں کوئی کرے کہاں تک

دل دھڑکے ہے جو بجلی چمکے ہے سوے گلشن
پہنچے مبادا میری خاشاک آشیاں تک
دیواروں سے بھی مارا پتھر سے پھوڑ ڈالا
پہنچا نہ سر ہمارا حیف اُس کے آستاں تک
یہ تنگی و نزاکت اس رنگ سے کہاں ہے
گلبرگ و غنچے پہنچیں کب اُن لب و دہاں تک

———:o:———

ردیف گ

بن جو کچھہ بن سکے جوانی میں
رات تو تھوڑی ہے بہت ہے سانگ
میر بندوں سے کام کب نکلا
مانگنا ہے جو کچھہ خدا سے مانگ

———

رہ مرگ سے کیوں ڈراتے ہیں لوگ
بہت اُس طرف کو تو جاتے ہیں لوگ

———:o:———

ردیف ل

سبزہ نورستہ رہگزار کا ہوں
سر اُٹھایا کہ ہوگیا پامال
کیوں نہ دیکھوں چمن کو حسرت سے
آشیاں تھا مرا بھی یاں پر سال
ہجر کی شب کو یاں تئیں تڑپا
کہ ہوا صبح ہوتے میرا وصال

———

عبارت خوب لکھی شاعری انشا طرازی کی
ولے مطلب ہی گم دیکھیں تو کب ہو مدعا حاصل

پھرا مت میر سر اپنا گراں گوشوں کی مجلس میں
سنے کوئی تو کچھ کہئے بھی، ایسے کہنے کا حاصل

آئی بہار نکلے چمن میں ہزار گل
دل جو کھلا فسردہ تو جوں بے بہار گل

گل کی جفا بھی دیکھی، دیکھی وفائے بلبل
یک مشت پر پڑے تھے گلشن میں جائے بلبل
کر سیر جذب الفت-گل چیں نے کل چمن میں
توڑا تھا شاخ گل کو، نکلی صدائے بلبل
کھٹکے ہیں خار ہوکر ہر شب دل چمن میں
اتنے لب و دہن پر یہ نالہائے بلبل
یکرنگیوں کی راہیں طے کر کے مر گیا ہے
گل میں رگیں نہیں ہیں، ہیں نقش ہائے بلبل
آی بہار و گلشن گل سے بھرا ہے لیکن
ہر گوشۂ چمن میں خالی ہے جائے بلبل
پیغام بے غرض بھی سنتے نہیں ہیں خوباں
پہنچی نہ گوش گل تک آخر دعائے بلبل
یہ دل خراش نالے ہر شب کے میر تیرے
کر دیں گے بے نمک ہی شور نوائے بلبل

طریق عشق میں ہے رہنما دل
پیمبر دل ہے، قبلہ دل، خدا دل
رکا اتنا، خفا اتنا ہوا تھا
کہ آخر خون ہو ہو کر بہا دل
جسے مارا اُسے پھر کر نہ دیکھا
ہمارا طرفہ ظالم سے لگا دل

گئے وحشت سے باغ و راغ میں تھے
کہیں ٹھہرا نہ، دنیا سے اُٹھا دل

اسیری میں تو کچھہ واشد کبھو تھا
رہا غمگیں ہوا جب سے رہا دل

ہمہ تن میں الم تھا سو نہ جانا
گرہ یہ درد ہے پہلو میں یا دل

خموشی مجھہ کو حیرت سے ہے ورنہ
بھرے ہیں لب سے لے کر شکوے تا دل

———:o:———

ردیف م

ہے پیچدار ازبس راہ وصال و ہجراں
ان دو ہی منزلوں میں برسوں سفر کرو تم

یہ ظلم ہے تو ہم بھی اس زندگی سے گزرے
سوگند ہے تمہیں اب جو در گزر کرو تم

روے سخن کہاں تک غیروں کی اور آخر
ہم بھی تو آدمی ہیں تک منہہ ادھر کرو تم

ہو عاشقوں میں اُس کے تو آؤ میر صاحب
گردن کو اپنی مو سے باریک تر کرو تم

کیا لطف ہے وگر نہ جس دم وہ تیغ کھینچے
سینہ سپر کریں ہم قطع نظر کرو تم

———

اگر راہ میں اُس کی رکھا ہے گام
گئے گزرے خضر علیہ السلام

دہن یار کا دیکھہ چپ لگ گئی
سخن یاں ہوا ختم حاصل کلام

قیامت ہی یاں چشم و دل سے رہی
چلے بس تو واں جاکے کرئے مقام

نہ دیکھے جہاں کوئی آنکھوں کی اور
نہ لیوے کوئی جس جگہ دل کا نام

گرچہ آوارہ جوں صبا ہیں ہم
لیک لگ چلنے میں بلا ہیں ہم
کام کیا آتے ہینگے معلومات
یہ تو سمجھے ہی نہ کہ کیا ہیں ہم
اے بتاں اس قدر جفا ہم پر
عاقبت بندۂ خدا ہیں ہم
کوئی خواہاں نہیں ہمارا میر
گوئیا جنس ناروا ہیں ہم

یہی جانا کہ کچھہ نہ جانا ہائے
سو بھی اک عمر میں ہوا معلوم

کس طور کوئی تجھہ سے مقصود کرے حاصل
نے رحم ترے جی میں نے دل میں ترس ظالم

میں خاک میں ملا نہ کروں کس طرح سفر
مجھہ سے غبار رکھتے ہیں اہلِ وطن تمام
کچھہ ہند ہی میں میر نہیں لوگ جیب چاک
ہے میرے ریختوں کا دوانا دکن تمام

جی کے تئیں چھپاتے نہیں یوں تو غم سے ہم
پر تنگ آگئے ہیں تمہارے ستم سے ہم
اپنے خیال ہی میں گزرتی ہے اپنی عمر
پر کچھہ نہ پوچھو سمجھے نہیں جاتے ہم سے ہم

هر هر سخن په اب تو کرتے هو گفتگو تم
اِن بد مزاجیوں کو چھوڑوگے بھی کبھو تم
چاهیں تو تم کو چاهیں دیکھیں تو تم کو دیکھیں
خواهش دلوں کی تم هو آنکھوں کی آرزو تم

کم پائی اس قدر هے منزل هے دور اتنی
طے کس طرح کروگے یارو یه مرحلے تم

میں کہا دیکھو ادھر تک تم تو میں بھی جان دوں
هنس کے بولے یه تری باتیں هیں پھر دیکھینگے هم

نه هوئے تھے ابھی جوان افسوس
صبر مغفور و طاقت مرحوم
جب غبار اپنے دل کا نکلے هے
دیر رهتی هے آندھی کی سی دھم
صاحب اپنا هے بندہ پرور میر
هم جہاں سے نه جائیں گے مرحوم

—:o:—

ردیف ن

بیکلی بے خودی کچھه آج نہیں
ایک مدت سے وہ مزاج نہیں
درد اگر یه هے تو مجھے بس هے
اب دوا کی کچھه احتیاج نہیں
هم نے اپنی سی کی بہت لیکن
مرض عشق کا علاج نہیں
شهر خوبی کو خوب دیکھا میر
جنس دل کا کہیں رواج نہیں

اس طرح دل گیا کہ اب تک ہم
بیٹھے روتے ہیں ہاتھ ملتے ہیں
اُمڈی آتی ہیں آج یوں آنکھیں
جیسے دریا کہیں اُبلتے ہیں
دم آخر ہے بیٹھ جا مت جا
صبر کر ٹک کہ ہم بھی چلتے ہیں
تیرے بیخود جو ہیں سو کیا چیتیں
ایسے ڈوبے کہیں اُچھلتے ہیں

دیں عمر خضر موسم پیری میں تو نہ لے
مرنا ہی اس سے خوب ہے عہد شباب میں

متصل روتے ہی رہئے تو بجھے آتش دل
ایک دو آنسو تو اور آگ لگا جاتے ہیں
وقت خوش اُن کا جو ہم بزم ہیں تیرے ہم ت
در و دیوار کو احوال سنا جاتے ہیں
ایک بیمار جدائی ہوں میں آپ ہی تسپر
پوچھنے والے جدا جان کو کھا جاتے ہیں
میر صاحب بھی ترے کوچے میں شب آتے ہیں
جیسے دریوزہ گری کرنے گدا جاتے ہیں

اس کے کوچے میں نہ کر شور قیامت کا ذکر
شیخ یاں ایسے تو ہنگامے ہوا کرتے ہیں
بے بسی سے تو تری بزم میں ہم بہرے ب
نیک و بد کوئی کہے بیٹھے سنا کرتے ہی
فرصت خواب نہیں ذکر بتاں میں ہم کو
رات دن رام کہانی سی کہا کرتے ہیں

یہ زمانہ نہیں ایسا کہ کوئی زیست کرے
چاہتے ہیں جو برا اپنا بھلا کرتے ہیں
محض ناکارہ ہی مت جان ہمیں تو کہ کہیں
ایسے نا کام بھی بے کار پھرا کرتے ہیں
تجھ بن اس جان مصیبت زدہ غم دیدہ پہ ہم
کچھ نہیں کرتے تو افسوس کیا کرتے ہیں
کیا کہیں میر جی ہم تم سے معاش اپنی غرض
غم کو کھایا کریں ہیں لوھو پیا کرتے ہیں

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ
مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

زباں رکھ غنچہ ساں اپنے دھن میں
بندھی مٹھی چلا جا اس چمن میں
کہاں عاجز سخن قادر سخن ہوں
ہمیں ہے شبہ یاروں کے سخن میں

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں
کس کا ہے قماش ایسا گودڑ بھرے ہیں سارے
دیکھو نہ جو لوگوں کے دیوان نکلتے ہیں

دعوے کو یار آگے معیوب کر چکے ہیں
اس ریختے کو ورنہ ہم خوب کر چکے ہیں
مرنے سے تم ہمارے خاطر نچنت رکھیو
اس کام کا بھی ہم کچھ اسلوب کر چکے ہیں
حسن کلام کھینچے کیوں کر نہ دامن دل
اس کام کو ہم آخر محبوب کر چکے ہیں

اپنی ہی سیر کرنے ہم جلوہ گر ہوے تھے
اس رمز کو ولیکن معدود جانتے ہیں

کچھہ کچھہ کہونگا روز یہ کہتا تھا دل میں میں
آشفتہ طبع میر کو پایا اگر کہیں ق
سو کل ملا مجھے وہ بیاباں کی سمت کو
جاتا تھا اضطراب زدہ سا ادھر کہیں
لگ چل کے میں برنگ صبا یہ اُسے کہا
کاے خانماں خراب ترا بھی ہے گھر کہیں
آشفتہ جا بجا جو پھرے ہے تو دشت میں
جاگہ نہیں ہے شہر میں تجھہ کو مگر کہیں
آسودگی سی زندگی جنس کو کرتا ہے کون سوخت
جانے ہے نفع کوئی بھی جی کا ضرر کہیں
موتی سے تیرے اشک ہیں غلطاں کسو طرف
یاقوت کے سے ٹکڑے ہیں لخت جگر کہیں
تاکے یہ دشت گردی وکب تک یہ خستگی
اس زندگی سے کچھہ تجھے حاصل ہے مر کہیں
کہنے لگا وہ ہوکے بر آشفتہ یک بیک
مسکن کرے ہے دھر میں مجھہ سا بشر کہیں
آوارہ گاں کو ننگ ہے سننا نصیحتیں
مت کہیو ایسی بات تو بار دگر کہیں
تعئیں جاکو بھول گیا ہوں پہ یہ ہے یاد
کہتا تھا ایک روز یہ اہل نظر کہیں ق
بیٹھے اگرچہ نقش ترا تو بھی دل اُٹھا
کرتا ہے جائے باش کوئی رہگذر کہیں
کتنے ہی آئے لے گئے سر پر خیال سیر
ایسے گئے کہ کچھہ نہیں اُن کا اثر کہیں

نہ تنگ کر اسے اے فکر روزگار کہ میں
دل اس سے دم کے لئے مستعار لایا ہوں

جفائیں دیکھ لیاں بے وفائیاں دیکھیں
بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں

تک سن کہ سو برس کی ناموس خامشی کہو
دو چار دن کی باتیں اب منہ پر آئیاں ہیں

میں کون ہوں اے ہم نفساں سوختہ جاں ہوں
اک آگ مرے دل میں ہے جو شعلہ فشاں ہوں

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر
میں ورنہ وہی خلوتی راز نہاں ہوں

جلوہ ہے مجھی سے لب دریائے سخن پر
صد رنگ مری موج ہے میں طبع رواں ہوں

پانجہ ہے مرا پنجۂ خورشید میں ہر صبح
میں شانہ صفت سایہ رو زلف بتاں ہوں

دیکھا ہے مجھے جن نے سو دیوانہ ہے میرا
میں باعث آشفتگئی طبع جہاں ہوں

تکلیف نہ کر آہ مجھے جنبش لب کی
میں صد سخن آغشتہ بخوں زیر زباں ہوں

ہوں زرد غم تازہ نہالان چمن سے
اس باغ خزاں دیدہ میں میں برگ خزاں ہوں

رکھتی ہے مجھے خواہش دل بس کہ پریشاں
درپے نہ ہو اس وقت خدا جانے کہاں ہوں

اک وہم نہیں بیش مری ہستی موہوم
اس پر بھی تری خاطر نازک پہ گراں ہوں

تا پھونکئے نہ خرقۂ طامات کے تئیں
حسن قبول کیا ہو مناجات کے تئیں

سید ہو یا چمار ہو اس جا وفا ہے شرط
کیا عاشقی میں پوچھتے ہیں ذات کے تئیں

آخر کے یہ سلوک ہم اب تیرے دیکھہ کر
کرتے ہیں یاد پہلی ملاقات کے تئیں

ایک دم پر ہے بنا تیری' سو آیا کہ نہیں
وہ کچھہ اس زندگی میں کر کہ تجھے یاد کریں

ریختہ خوب ہی کہتا ہے جو انصاف کرو
چاہئے اہل سخن میر کو اُستاد کریں

ملنے لگے ہو دیر دیر دیکھئے کیا ہے کیا نہیں
تم تو کرو ہو صاحبی بندے میں کچھہ رہا نہیں

بوئے گل اور رنگ گل دو نو ہیں دل کش اے نسیم
لیک بقدر یک نگاہ دیکھئے تو وفا نہیں

شکوہ کروں ہوں بخت کا اتنے غضب نہو بتاں
مجھہ کو خدا نخواستہ تم سے تو کچھہ گلا نہیں

نالے کیا نہ کر سنا' نوحے مرے پہ عندلیب
بات میں بات عیب ہے میں نے تجھے کہا نہیں

چشم سفید اشک سرخ آہ دل حزیں ہے یاں
شیشہ نہیں ہے مے نہیں ابر نہیں ہوا نہیں

ایک فقط ہے سادگی تسپہ بلائے جاں ہے تو
عشوہ کرشمہ کچھہ نہیں آن نہیں ادا نہیں

آب و ہوائے ملک عشق تجربہ کی ہے میں بہت
کر کے دوائے درد دل کوئی بھی پھر جیا نہیں

تجھہ عشق میں مرنے کو تیار بہت ہیں
یہ جرم ہے تو ایسے گنہگار بہت ہیں
کوئی تو زمزمہ کرے میرا سا دل خراش
یوں تو قفس میں اور گرفتار بہت ہیں

خوب رو سب کی جان ہوتے ہیں
آرزوے جہان ہوتے ہیں
کبھو آتے ہیں آپ میں تجھہ بن
گھر میں ہم میہمان ہوتے ہیں
کیا رہا ہے مشاعرہ میں اب
لوگ کچھہ جمع آن ہوتے ہیں
میر و مرزا رفیع و خواجۂ میر
کتنے اک یہ جوان ہوتے ہیں

جنوں میرے کی باتیں دشت اور گلشن میں جب چلیاں
نہ چوب گل نے دم مارا نہ چھڑیاں بید کی ہلیاں
تفاوت کچھہ نہیں شیرین و شکر اور یوسف میں
سبھی معشوق اگر پوچھے کوئی مصری کی ہیں ڈلیاں
دوانہ ہو گیا تو میر آخر ریختہ کہہ کہہ
نہ کہتا تھا میں اے ظالم کہ یہ باتیں نہیں بھلیاں

بزم میں جو ترا ظہور نہیں
شمع روشن کے منہ پہ نور نہیں
کتنی باتیں بنا کے لاؤں ایک
یاد رہتی ترے حضور نہیں
فکر مت کر ہمارے جینے کا
تیرے نزدیک کچھہ یہ دور نہیں

پھر جئینگے جو تجھہ سے جاں بخش
ایسا جینا ہمیں ضرور نہیں

عام ہے یار کی تجلی میر
خاص موسی و کوہ طور نہیں

داماں وجیب و دیدہ ومژگاں و آستیں
اب کون سا رہا ہے کہ اُن میں سے تر نہیں

مسجد سے میکدے پر کاش ابر روز برسے
واں رو سفیدیاں ہیں یاں روسیاہیاں ہیں

غالب تو یہ ہے زاہد رحمت سے دور ہوے
درکار واں گنہ ہیں یاں بے گناہیاں ہیں

شاہد لوں میر کس کو اہل محلہ سے میں
محضر پہ خون کے میرے سب کی گواہیاں ہیں

تجھے بھی یار اپنا یوں تو ہم ہر بار کہتے ہیں
ولے کم ہیں بہت وے لوگ جن کو یار کہتے ہیں

سمجھہ کر ذکر کر آسودگی کا مجھہ سے اے ناصح
وہ میں ہی ہوں کہ جس کو عاقبت بیزار کہتے ہیں

عجب ہوتے ہیں شاعر بھی میں اس فرقے کا عاشق ہوں
کہ بے دھڑک بھری مجلس میں یہ اسرار کہتے ہیں

داد لے چھوڑوں میں صیاد سے اپنی لیکن
ضعف سے میرے تئیں طاقت فریاد نہیں

کیا کہوں میر فراموش کیا اُن نے تجھے
میں تو تقریب بھی کی پر تو اُسے یاد نہیں

یک لحظہ سینہ کوبی سے فرصت ہمیں نہیں
یعنی کہ دل کے جانے کا ماتم بہت ہے یاں

ہم رہرواں راہ فنا دیر رہ چکے
وقفہ بسان صبح کوئی دم بہت ہے یاں

اس بتکدے میں معنی کا کس سے کریں سوال
آدم نہیں ہے صورت آدم بہت ہے یاں

عالم میں لوگ ملنے کے گوں اب نہیں رہے
ہر چند ایسا ویسا تو عالم بہت ہے یاں

ویسا چمن سے سادہ نکلتا نہیں کوئی
رنگینی ایک اور خم وچم بہت ہے یاں

شاید کہ کام صبح تک اپنا کھنچے نہ میر
احوال آج شام سے درہم بہت ہے یاں

کھول کر دیوان میرا دیکھہ قدرت مدعی
گرچہ ہوں میں نوجواں پرشاعروں کا پیر ہوں

کہے ہے کوہ کن کر فکر میری خستہ حالی میں
الہی شکر کرتا ہوں تری درگاہ عالی میں

میں وہ پژ مردہ سبزہ ہوں کہ ہوکر خاک سے سرزد
یکا یک آگیا اس آسماں کی پائمالی میں

نہ کیوں کہ شیخ توکل کو اختیار کریں
زمانہ ہووے مساعد تو روزگار کریں

گیا وہ زمزمۂ صبح فصل گل بلبل
دعا نہ پہنچی چمن تک ہم اب ہزار کریں

تمام صید سر تیر جمع ہیں لیکن
نصیب اس کے کہ جس کو ترا شکار کریں

تو اک زباں پہ چپکی نہیں رہتی عندلیب
رکھتا ہے منہ پہ غنچۂ گل سو زباں کے تئیں

ہم تو ہوئے تھے میر سے اس دن ہی نااُمید
جس دن سناکہ ان نے دیا دل بتاں کے تئیں

موے سہتے سہتے جفا کاریاں
کوئی ہم سے سیکھے وفاداریاں
ہماری تو گزری اسی طور عمر
یہی نالہ کرنا یہی زاریاں
فرشتہ جہاں کام کرتا نہ تھا
مری آہ نے برچھیاں ماریاں
گیا جان سے یک جہاں لیک شوخ
نہ تجھہ سے گئیں یہ دل آزاریاں
خط و کاکل وزلف و انداز و ناز
ہوئیں دام رہ صد گرفتاریاں
کیا درد و غم نے مجھے نا امید
کہ مجنوں کو یہ بھی تھیں بیماریاں
تری آشنائی سے ہی حد ہوئی
بہت کی تھیں دنیا میں ہم یاریاں
نہ بھائی ہماری تو قدرت نہیں
کھنچیں میر تجھہ سے ہی یہ خواریاں

دن نہیں رات نہیں صبح نہیں شام نہیں
وقت ملنے کا مگر داخل ایام نہیں
مثل عنقا مجھے تم دور سے سن لو ورنہ
ننگ ہستی ہوں مری جائے بجز نام نہیں
بے قراری جو کوئی دیکھے ہے سو کہتا ہے
کچھہ تو ہے میر کہ اک دم تجھے آرام نہیں

آرزوئیں ہزار رکھتے ہیں
تو بھی ہم دل کو مار رکھتے ہیں

برق کم حوصلہ ہے ہم بھی تو
دلک بے قرار رکھتے ہیں

غیر ہے مورد عنایت ہائے
ہم بھی تو تم سے پیار رکھتے ہیں

نہ نگہہ نے پیام نے وعدہ
نام کو ہم بھی یار رکھتے ہیں

ہم سے خوش زمزمہ کہاں یوں تو
لب و لہجہ ہزار رکھتے ہیں

چوٹتے دل کے ہیں بتاں مشہور
بس یہی اعتبار رکھتے ہیں

پھر بھی کرتے ہیں میر صاحب عشق
ہیں جواں' اختیار رکھتے ہیں

یہ جو چشم پر آب ہیں دونوں
یک خانہ خراب دونوں

رونا آنکھوں کا روئیے کب تک
پھوٹنے ہی کے باب ہیں دونوں

ہے تکلف نقاب' وے رخسار
کیا چھپیں آفتاب ہیں دونوں

تن کے معمورے میں یہی دل و چشم
گھر تھے دو' سو خراب ہیں دونوں

کچھ نہ پوچھو کہ آتش غم سے
جگر و دل کباب ہیں دونوں

ایک سب آگ ایک سب پانی
دیدہ و دل عذاب ہیں دونوں

آگے دریا تھے دیدۂ تر میر
اب جو دیکھو سراب ہیں دونوں

مدعی مجھہ کو کھڑے صاف برا کہتے ھیں
چپکے تم سنتے ھو بیٹھے اسے کیا کہتے ھیں
دیکھے خوباں کے بجا دل نہیں رھتا ھرگز
لوگ جو کچھہ نہیں کہتے ھیں بجا کہتے ھیں
حسن تو ھے ھی کرو لطف زباں بھی پیدا
میر کو دیکھو کہ سب لوگ بھلا کہتے ھیں

دیر و حرم سے تو تو ٹک گرم ناز نکلا
ھنگامہ ھو رھا ھے اب شیخ و برھمن میں
ھیں گھاؤ دل پر اپنے تیغ زباں سے سب کی
تب درد ھے ھمارے اے میر ھر سخن میں

طائران خوش معاش اس باغ کے تھے ھم کبھو
اب ترستے ھیں قفس میں اک پر افشانی کے تئیں
دل جو پانی ھو تو آئینہ ھے روے یار کا
خانہ آبادی سمجھہ اس خانہ ویرانی کے تئیں
فہم میں میرے نہ آیا پردہ در ھے طفل اشک
روؤں کیا اے ھم نشیں میں اپنی نادانی کے تئیں

کیا کہوں اول بخود تو دیر میں آتا ھوں میں
پھر جو یاد آتا ھے وہ' چپکا سا رہجاتا ھوں میں

کیا جانوں دل کو کھینچے ھیں کیوں شعر میر کے
کچھہ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں

کعبے جانے سے نہیں کچھہ مجھہ کو اتنا شوق ھے
چال وہ بتلا کہ میں دل میں کسو کے جا کروں

اب کہ ہمت صرف کر جو اس سے جی اچٹے مرا
پھر وہی اے میر مت کریو اگر کروں

عشق میں جی کو صبر وتاب کہاں
اس سے آنکھیں لگیں تو خواب کہاں

ہستی اپنی ہے بیچ میں پردہ
ہم نہ ہوویں تو پھر حجاب کہاں

گریۂ شب سے سرخ ہیں آنکھیں
مجھ بلا نوش کو شراب کہاں

عشق کا گھر ہے میر سے آباد
ایسے پھر خانماں خراب کہاں

میں تو خوباں کو جانتاہی ہوں
پر مجھے بھی یہ خوب جانے ہیں

اب تو افسردگی ہی ہے ہر آن
وے نہ ہم ہیں نہ وے زمانے ہیں

قیس و فرہاد کے وہ عشق کے شور
اب مرے عہد میں فسانے ہیں

مشک و سنبل کہاں وہ زلف کہاں
شاعروں کے یہ شاخسانے ہیں

عشق کرتے ہیں اُس پری روسے
میر صاحب بھی کیا دوانے ہیں

اب کے جنون میں فاصلہ شاید ہی کچھہ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

گل پھول کوئی کب تک جھڑ جھڑ کے گرتے دیکھے
اس باغ میں بہت اب جوں غنچہ میں رکا ہوں

کب شب ہوئی زمانے میں جو پھر ہوا نہ روز
کیا اے فراق یار تجھی کو سحر نہیں
ہر چند ہم کو مستوں سے صحبت رہی ہے لیک
دامن ہمارا ابر کے مانند تر نہیں

میں جی سنبھالتا ہوں وہ ہنس کے تالتا ہے
یاں مشکلیں ہیں ایسی واں یہ مساھلے ہیں

باغ گو سبز ہوا' اب سر گلزار کہاں
دل کہاں وقت کہاں عمر کہاں یار کہاں
دم زدن مصلحت وقت نہیں اے ہمدم
جی میں کیا کیا ہے مرے پر لب اظہار کہاں

یہ جوش غم ہوتے بھی ہیں یوں ابر تر روتے بھی ہیں
چشم جہاں آشوب سے دریا بہایا ایک میں
ہیں طالب صورت سبھی مجھہ پر ستم کیوں اسقدر
کیا مجرم عشق بتاں یاں ہوں خدایا ایک میں
بجلی سے یوں چمکے بہت پر بات کہتے ہوچکے
جوں ابر ساری خلق پر ہوں اب تو چھایا ایک میں

صبح چمن کا جلوہ ہندی بتوں میں دیکھا
صندل بھری جبیں ہیں ہونٹوں کی لالیاں ہیں
اجماع بوالہوس کو رکھہ رکھہ لیا ہے آگے
مت جان ایسی بھڑیں جاں دینے والیاں ہیں
ان گلرخوں کی قامت لہکے ہے یوں ہوا میں
جس رنگ سے لچکتی پھولوں کی ڈالیاں ہیں

رفتگاں میں جہاں کے ہم بھی ہیں
ساتھہ اس کارواں کے ہم بھی ہیں
جس چمن زار کا ہے تو گل تر
بلبل اس گلستاں کے ہم بھی ہیں
وجہ بیگانگی نہیں معلوم
تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں
مرگئے مرگئے نہیں تو نہیں
خاک سے منہ کو ڈھانکے ہم بھی ہیں

زبانیں بدلتے ہیں ہر آن خوباں
یہ سب کچھہ ہیں بگڑے زمانے کی باتیں
ہمیں دیر و کعبے سے کیا گفتگو ہے
چلی جاتی ہیں یہ سیانے کی باتیں

کچھہ تمہیں ملنے سے بیزار ہو میرے ورنہ
دوستی ننگ نہیں عیب نہیں عار نہیں
ناز و انداز و ادا عشوہ و اغماز و حیا
آب و گل میں ترے سب کچھہ ہے یہی پیار نہیں
صورت آئینے میں تک دیکھہ تو کیا صورت ہے
بد زبانی تجھے اس منہ پہ سزاوار نہیں
دل کے الجھاؤ کو کیا تجھہ سے کہوں اے ناصح
تو کسو زلف کے پھندے میں گرفتار نہیں

جہاں سے دیکھئے اک شعر شور انگیز نکلے ہے
قیامت کا سا ہنگامہ ہے جا میرے دیواں میں

اب پست و بلند ایک ہے جوں نقش قدم یاں
پامال ہوا خوب تو ہموار ہوا میں

کیا چیتنے کا فائدہ جو شیب میں چیتا
سونے کا سماں آیا تو بیدار ہوا میں

جائے ہے جی نجات کے غم میں
ایسی جنت گئی جہنم میں
بے خودی پر نہ میر کی جاؤ
تم نے دیکھا ہے اور عالم میں

مجھہ کو دماغ و صف گل و یا سمن نہیں
میں جوں نسیم باد فروش چمن نہیں
کل جاکے ہم نے میر کے هاں یہ سنا جواب
مدت ہوی کہ یہاں وہ غریب الوطن نہیں

تم کہو میر کو چا ہو سو' کہ چاھیں ھیں تمھیں
اور هم لوگ تو سب اُن کا ادب کرتے ھیں

نئی گردش ہے اس کی هر زماں میں
خلل سا ہے دماغ آسماں میں
کہا میں درد دل یا آگ اُگلی
پھپولے پڑ گئے میری زباں میں
تری شورش بھی بے کل ہے مگر میر
ملادی پیس کر بجلی فغاں میں

محبوب کا وصال نہ مجھہ کو ہوا نصیب
دل سے ہزار خواهشیں سر کو پٹک گئیں
بھردی تھی چشم ساقی میں یارب کہاں کی مے
مجلس کی مجلسیں نظر اک کرتے جھک گئیں

غزل میر کی کب پڑھائی نہیں
کہ حالت مجھے غش کی آئی نہیں
زباں سے ہماری ہے صیاد خوش
ہمیں اب اُمید رھائی نہیں

نسیم آئی میرے قفس میں عبث
گلستاں سے دو پھول لائی نہیں

اس شہ حسن کا اقبال کہ ظالم کے تئیں
ہر طرف سیکڑوں درویش دعا دیتے ہیں
طرفہ صناع ہیں اے میر یہ موزوں طبعاں
بات جاتی ہے بگڑ بھی تو بنا دیتے ہیں

پنج روزہ عمر کریے عاشقی یا زاھدی
کام کچھہ چلتا نہیں اس تھوڑی سی مہلت سے یاں
کیا سر جنگ و جدل ہو بے دماغ عشق کو
صلح کی ہے میر نے ھفتاد و دو ملت سے یاں

پھرا میں صورت احوال ہر اک کو دکھاتا یاں
مروت قحط ہے آنکھیں نہیں کوئی ملاتا یاں
خرابہ دھلی کا وہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا
وھیں میں کاش مر جاتا سراسیمہ نہ آتا یاں

دن ہیں بڑے کبھو کے راتیں بڑی کبھو کی
رھتے نہیں ہیں یکساں لیل و نہار دونوں

پیری ہی اب تو کہئے سو کیا کہئے ہم نشیں
کس رنج و غم میں گزریں ہیں اپنی جوانیاں

ظلم و ستم سے خون کیا پھر دیا رھا
بر باد کیا گئیں ھیں مری جانفشانیاں

میں آپ چھیڑ چھیڑ کے کھاتا ھوں گالیاں
خوش آگئیں ھیں اُس کی مجھے بد زبانیاں

سنتا نہیں ھے شعر بھی وہ حرف ناشنو
دل ھی میں خوں ھوا کیں مری نکتہ دانیاں

باتیں کڈھب رقیب کی ساری ھوئیں قبول
مجھہ کو جو اُن سے عشق تھا میری نمانیاں

مجلس میں تو خفیف ھوئے اُس کے واسطے
پھر اور ھم سے اُتھتی نہیں سر گرانیاں

عالم کے ساتھہ جائیں چلے کس طرح نہ ھم
عالم تو کاروان ھے ھم کاروانیاں

درا میں کہاں شور ایسا دھرا تھا
کسو کا مگر دل رکھا تھا جرس میں

ھمیں عشق میں بے کسی بے بسی ھے
نہ دشمن بھی ھو دوستی کے تو بس میں

تن زار لاغر میں ظاھر رگیں ھیں
بھرا ھے مگر عشق اک ایک نس میں

محبت وفا مہر کرتے تھے باھم
اُتھا دی ھیں وے تم نے اب ساری رسمیں

غم ھجراں میں گھبرا کر اُتھا میں
طرف گلزار کے آیا چلا میں

شگفتہ خاطری اُس بن کہاں تھی
چمن میں غنچہ پیشانی رھا میں

کسو سے دل نہیں ملتا ھے یارب
ھوا تھا کس گھڑی اُن سے جدا میں

تعارف ھمصفیروں سے نہیں کچھہ
ہوا ہوں ایک مدت میں رہا میں
گیا صبر آخر آزار دلی پر
بہت کرتا رہا دارو دوا میں
ہوا تھا میر مشکل عشق میں کام
کیا پتھر جگر تب کی دوا میں

فریاد سے کیا لوگ ہیں دن ہی کو عجب میں
رہتی ہے خلش نالوں سے میرے دل شب میں

اس کو دل سا مکان دیتے ہیں
اہل اس گھر پہ جان دیتے ہیں
کیوں کہ خوش خواں نہ ہوئیں اہل چمن
ہم انہوں کو زبان دیتے ہیں
جان کیا گوہر گرامی ہے
بدلے اس کے جہان دیتے ہیں

کوئی سبب ایسا ہو یا رب جس سے عزت رہ جاے
عالم میں اسباب کے ہیں پر پاس اپنے اسباب نہیں
رنگ شکستہ ' دل ہے شکستہ ' سر ہے شکستہ ' مستی میں
حال کسو کا اپنا سا اس میخانے میں خراب نہیں

مے کشی صبح و شام کرتا ہوں
فاقہ مستی مدام کرتا ہوں
کوئی ناکام یوں رہے کب تک
میں بھی اب ایک کام کرتا ہوں
یا تو لیتا ہوں داد دل یا اب
کام اپنا تمام کرتا ہوں

اُس سے گھبرا کے جو کچھ کہنے پہ آتا ہوں
دل کی پھر دل میں لئے چپکا چلا جاتا ہوں

سعی دشمن کو نہیں دخل مری ایذا میں
رنج سے عشق کے میں آپ کھپا جاتا ہوں

گوچہ کھویا سا گیا ہوں پہ تہ حرف سخن
اس فریبندۂ عشاق کی پا جاتا ہوں

خشم کیوں، بے مزگی کاہے کو، بے لطفی کیا
بد برا اتنا بھی نہ ہو مجھ سے بھلا جاتا ہوں

استقامت سے ہوں جوں کوہ قوی دل لیکن
ضعف سے عشق کے ڈھتا ہوں گرا جاتا ہوں

مجلس یار میں تو بار نہیں پاتا میں
در و دیوار کو احوال سنا جاتا ہوں

اک بیاباں ہے مری بے کسی و بے تابی
جیسے آواز جرس میں سے جدا جاتا ہوں

تنگ آوے گا کہاں تک نہ مرا قلب سلیم
بگڑی صحبت کے تئیں روز بنا جاتا ہوں

اب دیکھیں آہ کیا ہو ہم وے جدا ہوے ہیں
بے یار و بے دیار و بے آشنا ہوے ہیں

غیرت سے نام اس کا آیا نہیں زباں پر
آگے خدا کے جب ہم محو دعا ہوے ہیں

اہل چمن سے کیوں کر اپنی ہو روشناسی
برسوں اسیر رہ کر اب ہم رہا ہوے ہیں

بے کار مجھکو مت کہہ میں کار آمدہ ہوں
بیگانہ وضع تو ہوں پر آشنا زدہ ہوں

میں منہ نہیں لگایا بنت عنب کو کاہے
تب تھا جوان صالح اب پیر میکدہ ہوں

اسرار دل کے کہتے ہیں پیر و جوان میں
مطلق نہیں ہے بند ہماری زبان میں
رنگینی زمانہ سے خاطر نہ جمع رکھ
سو رنگ بدلے جاتے ہیں یاں ایک آن میں
شاید بہار آئی ہے دیوانے ہیں جواں
زنجیر کی سی آتی ہے جھنکار کان میں

موے پر اور بھی کچھ بڑھ گئی رسوائی عاشق
کہ اس کی نعش کو اب شہر میں تشہیر کرتے ہیں
در و دیوار افتادہ کو بھی کاش اک نظر دیکھیں
عمارت ساز مردم گھر جواب تعمیر کرتے ہیں

عشق کرنا نہیں آسان بہت مشکل ہے
چھاتی پتھر کی ہے ان کی جو وفا کرتے ہیں

نا آشنا کے اپنے جیسے ہم آشنا ہیں
اس طور اس طرح کے ایسے کم آشنا ہیں
باہم جو یاریاں ہیں اور آشنائیاں ہیں
سب ہیں نظر میں اپنی ہم عالم آشنا ہیں

کیا جنوں ہے تم کو جو تم طالب ویرانہ ہو
جس کو فردوس بریں کہتے ہیں واں آدم کہاں

گو کہ بت خانے جا رہا ہوں میں
بخدا باخدا رہا ہوں میں
سب گئے دل دماغ و تاب و تواں
میں رہا ہوں سو کیا رہا ہوں میں

برق تو میں نہ تھا کہ جل بجھتا
ابر تر ہوں کہ چھا رہا ہوں میں

کچھ اور شے ہے خوب جو دیکھو رخ نگار
ہر چند گل بھی تازہ کھلا اتنا بد نہیں

اس بے کسی سے کون جہاں میں موا کہ میں
جز داغ سینہ آج چراغ لحد نہیں

بے سوز دل کنھوں نے کیا ریختہ تو کیا
گفتار خام پیش عزیزاں سند نہیں

سو بار مست کعبے میں پکڑے گئے ہیں ہم
رسوائی کے طریق کے کچھ نابلد نہیں

لطف سخن بھی پیری میں رہتا نہیں ہے میر
اب شعر ہم پڑھے ہیں تو وہ شد و مد نہیں

جو جو ظلم کئے ہیں تم نے سو سو ہم نے اُٹھائے ہیں
داغ جگر پہ جلائے ہیں چھاتی پہ جراحت کھائے ہیں

تیغ دریغ نہیں ہے اس کے بسمل گہ میں کسو سے بھی
ہیں تو شکار لاغر ہم پر ایک اُمید پہ آئے ہیں

خم سے لگی میخانے کی دیوار بھی اپنے گھر کی ہے
لطف پیر مغاں عجب کیا ہم آخر ہمسائے ہیں

شوق ہے غم میں بے صبری ہے آہ کسو کو کیا کہئے
اچھے اپنے دل کو ہم نے آپ ہی روگ لگائے ہیں

محو سخن ہم فکر سخن میں رفتہ ہی بیٹھے رہتے ہیں
آپ کو جب کھویا ہم نے تب سے گوہر پائے ہیں

تب تھے سپاہی اب ہیں جوگی آہ جوانی یوں کاٹی
ایسی تھوڑی رات میں ہم نے کیا کیا سوانگ بنائے ہیں

کون وہ ایسا ظالم تھا اُستاد فن عیاری کا
انکھ سن میں جن نے تجھ کو ایسے فریب سکھائے ہیں

میر مقدس آدمی ہیں تھے سبحہ بکف میخانے میں
صبح جو ہم بھی جانکلے تو دیکھہ کے کیا شرمائے ہیں

———

کبھے کون صید رمیدہ سے کہ ادھر بھی بھر کے نظر کرے
کہ نقاب اُلٹے سوار ھے ترے پیچھے کوئی غبار میں
تری شام خط کے قریب کے جو صفا میں دیکھی ہیں خوبیاں
نہ سموں یہ گل میں نظر پڑے نہ یہ رنگ صبح بہار میں
کوئی شعلہ ھے کہ شرارہ ھے کہ ہوا ھے یہ کہ ستارہ ھے
یہی دل جولے کے گریں گے ہم تو لگے گی آگ مزار میں
جھکی کچھہ کہ جی میں چبھی سبھی ہائی تک کہ دل میں کھبی سبھی
یہ جو لاگ پلکوں میں اسکی ھے نہ چھری میں ھے نہ کٹار میں

———:o:———

ردیف و

ہوے تھے جیسے مرجاتے پر اب تو سخت حسرت ھے
کیا دشوار نادانی سے ہم نے کار آساں کو
تجھے گر چشم عبرت ھے تو آندھی اور بگولے سے
تماشا کر غبار افشانی خاک عزیزاں کو
غم و اندوہ بیتابی الم بے طاقتی حرماں
کہوں اے ہم نشیں تا چند غمہاے فراواں کو
کوئی کانٹا سرہ کا ہماری خاک پر بس ھے
گل گلزار کیا درکار ھے گور غریباں کو
کیا سیر اس خرابی کا بہت اب چلکے سو رہئے
کسو دیوار کے سائے میں منہ پر لیکے داماں کو

———

کہتے ہو اتحاد ھے ہمکو
ہاں کہو اعتماد ھے ہمکو

شوق ہی شوق ہے نہیں معلوم
اس سے کیا دل نہاد ہے ہم کو
آہ کس ڈھب سے روے کم کم
شوق حد سے زیاد ہے ہم کو
شیخ و پیر مغاں کی خدمت میں
دل سے اک اعتقاد ہے ہم کو
نامرادانہ زیست کرتا تھا
میر کا طور یاد ہے ہم کو

خدا کرے کہ نصیب اپنے ہو نہ آزادی
کدھر کے ہو رہے جو بے بال و پر رہائی ہو
اُس آفتاب سے تو فیض سب کو پہنچے ہے
یقیں ہے کہ کچھ اپنی ہی نارسائی ہو
ہزار مرتبہ بہتر ہے بادشاہی سے
اگر نصیب ترے کوچے کی گدائی ہو
مغاں سے راہ تو ہو جاے رفتہ رفتہ شیخ
ترا بھی قصد اگر ترک پارسائی ہو

تا چند کوچہ گردی جیسے صبا زمیں پر
اے صبحگاہی آشوب آسماں ہو
گر ذوق سیر ہے تو آوارہ اس چمن میں
مانند عندلیب گم اکردہ آشیاں ہو
ہم دور ماندگاں کی منزل رساں مگر اب
یا ہو صدا جرس کی یاد گرد کارواں ہو
یہ جان تو کہ ہے اک آوارہ دست بردال
خاک چمن کے اوپر برگ خزاں جہاں ہو
ہمساے اُس چمن کے کتنے شکستہ پر ہیں
ان کے لئے کہ شاید اک باد گلفشاں ہو

دن گزرتا ہے مجھے فکر ہی میں تا کیا ہو
رات جاتی ہے اسی غم میں کہ فردا کیا ہو
ایک رونا ہی نہیں آہ غم و نالہ و درد
ہجر میں زندگی کرنے کے تئیں کیا کیا ہو

جاتے نہیں اُتھائے یہ شور ہر سحر کے
یا اب چمن میں بلبل ہم ہی رہیں گے یا تو
عالم ہے شوق کشتہ خلقت ہے تیری وفتہ
جانوں کہ آرزو تو آنکھوں کا مدعا تو
گفت و شنود اکثر میرے ترے رہے ہے
ظالم معاف رکھیو میرا کہا سنا تو
کہہ سانجھ کے موئے کو اے میر روئیں کب تک
جیسے چراغ مفلس اک دم میں جل بجھا تو

خوبی یہی نہیں ہے کہ انداز و ناز ہو
معشوق کا ہے حسن اگر دل نواز ہو
ہے فرق میں ہی خیر نہ کر آرزوے وصل
مل بیٹھئے جو اُس سے تو شکوہ دراز ہو
جوں توں نہ اس کے چاؤ کا پردہ کیا ہے میں
اے چشم گریہ ناک نہ افشاے راز ہو
ہم سے تو غیر عجز کبھو کچھ بنا نہ میر
خوش حال وہ فقیر کہ جو بے نیاز ہو

عشق کو نفع نہ بیتابی کرے ہے نہ شکیب
کریے تدبیر جو یہ درد دوا رکھتا ہو
ہاے اس زخمی شمشیر محبت کا جگر
درد کو اپنے جو ناچار چھپا رکھتا ہو

ایسے تو حال کے کہنے سے بھلی خاموشی
کہئے اُس سے جو کوئی اپنا کہا رکھتا ہو
گل ہو مہتاب ہو آئینہ ہو خورشید ہو میر
اپنا محبوب وہی ہے جو ادا رکھتا ہو

شیخ جی آؤ مصلیٰ گرو جام کرو
جنس تقویٰ کے تئیں صرف مے جام کرو
فرش مستاں کرو سجادۂ بے تہ کے تئیں
مے کی تعظیم کرو شیشے کا اکرام کرو
دامن پاک کو آلودہ رکھو بادے سے
آپ کو مغبچوں کے قابل دشنام کرو
نیک نامی و تفاوت کو دعا جلد کہو
دین و دل پیش کش سادۂ خود کام کرو
ننگ و ناموس سے اب گزرو جوانوں کیطرح
پر فشانی کرو اور ساقی سے ابرام کرو
اُٹھ کھڑے ہو جو جھکے گردن مینائے شراب
خدمت بادہ گساراں ہی سر انجام کرو
خشکی اتنی بھی تو لازم نہیں اس موسم میں
پاس جوش گل و دل گرمی ایام کرو
سایۂ گل میں لب جو پہ گلابی رکھو
ہاتھ میں جام کو لو آپ کو بدنام کرو
آہ تا چند رہو خانقہ و مسجد میں
ایک تو صبح گلستان میں بھی شام کرو
رات ساری تو گئی سنتے پریشان گوئی
میر جی کوئی گھڑی تم بھی تو آرام کرو

ہیں کہاں مجھ سے وفا پیشہ نہ بیداد کرو
نہ کرو ایسا کہ پھر میرے تئیں یاد کرو

ایسے غم پیشہ کہاں ہوتے ہیں اے غمزدگاں
مرگ مجنوں پہ کڑھو ماتم فرہاد کرو
اے اسیران تہ دام نہ تڑپو اتنا
تا نہ بدنام کہیں چنگل صیاد کرو

صبح سے اور بھی پاتا ہوں اُسے شام کو تند
کام کرتی جو کچھ میری دعا مت پوچھو
ہوش و صبر و خرد و دیں و حواس و دل و تاب
اُس کے اک آنے میں کیا کیا نہ گیا مت پوچھو
وقت قتل آرزوے دل جو لگے پوچھنے لوگ
میں اشارت کی اُدھر اُن نے کہا مت پوچھو
خواہ مارا اُنھیں نے میر کو یا آپ موا
جانے دو یارو جو ہونا تھا ہوا مت پوچھو

اس کی طرز نگاہ مت پوچھو
جی ہی جانے ہے آہ مت پوچھو
کہیں پہنچوگے بے رہی میں بھی
مگر ہاں یوں یہ راہ مت پوچھو
نو گرفتار دام زلف اس کا
ہے یہی روسیاہ مت پوچھو

سائے میں ہر پلک کے خوابیدہ ہے قیامت
اس فتنۂ زماں کو کوئی جگا تو دیکھو
بلبل بھی گل گئی، پر مر کر چمن سے نکلی
اس مرغ شوق کش کی تک تم وفا تو دیکھو
ڈوبے ہے کشتی میری بحر عمیق غم میں
بیگانے سے کھڑے ہو تم آشنا تو دیکھو

آئے جو ہم تو اُن نے آنکھوں میں ہم کو رکھا
اہل ہوس سے کوئی اودھر کو جا تو دیکھو

یہی مشہور عالم ہیں دو عالم
خدا جانے ملاپ اُس سے کہاں ہو
جہاں سجدے میں ہم نے غش کیا تھا
وہیں شاید کہ اس کا آستاں ہو
ہوئے ہم پیر سو ساکت ہیں اب میر
تمھاری بات کیا ہے تم جواں ہو

صحبت آخر ہے ہماری نہ کرو پھر افسوس
متصل ہو سکے تو ہم سے ملاقات کرو
بس بہت وقت گیا شعر کے فن میں ضائع
میر اب پیر ہوئے ترک خیالات کرو

مطرب نے پڑھی تھی غزل اک میر کی شب کو
مجلس میں بہت وجد کی حالت رہی سب کو
برسوں تئیں جب ہم نے تردد کئے ہیں تب
پہنچایا ہے آدم تئیں واعظ کے نسب کو
حیرت ہے کہ ہے مدعی معرفت اک خلق
کچھ ہم نے تو پایا نہیں اب تک ترے ڈھب کو
ہوگا کسو دیوار کے سائے میں پڑا میر
کیا کام محبت سے اُس آرام طلب کو

نہ نو طالع نہ جذب پھر دل کو
کس بھروسے پہ تک تحمل ہو
لگ نہ چل اے نسیم باغ کہ میں
رہ گیا ہوں چراغ سا گل ہو

دیر رہنے کی جا نہیں یہ چمن
بوئے گل ہو صفیر بلبل ہو
مجھ دوانے کی مت ہلا زنجیر
کہیں ایسا نہ ہو کہ پھر غل ہو

مت تربت میر کو مٹاؤ
رہنے دو غریب کا نشاں تو

ہو کوئی بادشاہ کوئی یاں وزیر ہو
اپنی بلا سے بیٹھ رہے جب فقیر ہو
کس طرح آہ خاک مذلت سے میں اٹھوں
افتادہ تر جو مجھ سے مرا دستگیر ہو
حد سے زیادہ جور و ستم خوشنما نہیں
ایسا سلوک کر کہ تدارک پذیر ہو
دم بھر نہ ٹھیرے دل میں نہ آنکھوں میں ایک پل
اتنے سے قد پہ تم بھی قیامت شریر ہو
اک وقت خاص حق میں مرے کچھ دعا کرو
تم بھی تو میر صاحب و قبلہ فقیر ہو

کیا کیا جوان ہم نے دنیا سے جاتے دیکھے
اے عشق بے محابا دنیا ہو اور تو ہو
ایسے کہو گے کچھ تو ہم چپکے ہو رہینگے
ہر بات پر کہاں تک آپس میں گفتگو ہو

جنبش بھی اُس کے آگے ہونٹوں کو ہو تو کہیو
یوں اپنے طور پر تم باتیں بہت بنا لو
بازاری سارے دے ہی کہتے ہیں راز بیٹھے
جن کو ہمیں کہا ہے تم منہ سے مت نکالو

اس باغ کے ہر گل سے چپک جاتی ہیں آنکھیں
مشکل بنی ہے آن کے صاحب نظروں کو

کھنچا ہے آدمی نے بہت دور آپ کو
اس پردے میں خیال تو کر تک خدا نہ ہو

لطف شراب ابر سے ہے سو نصیب دیکھہ
جب لیویں جام ہاتھہ میں تب آفتاب ہو
ہستی پر ایک دم کی تمہیں جوش اس قدر
اس بحر موج خیز میں تم تو حباب ہو
قتل کئے پر غصہ کیا ہے لاش مری اُٹھوانے دو
جان سے بھی ہم جاتے رہے ہیں تم بھی آؤ جانے دو
اب کے بہت ہے شور بہاراں ہم کو مت زنجیر کرو
دل کی ہوس تک ہم بھی نکالیں دھومیں ہم کو مچانے دو
عرصہ کتنا سارے جہاں کا وحشت پر جو آجائیں
پاؤں تو ہم پھیلائینگے پر فرصت ہمکو پانے دو
ضعف بہت ہے میر تمہیں کچھہ اس کی گلی میں مت جاؤ
صبر کرو تک اور بھی صاحب طاقت جی میں آنے دو
بات بنانا مشکل سا ہے شعر سبھی یاں کہتے ہیں
فکر بلند سے یاروں کو اک ایسی غزل کہہ لانے دو

یہ سرا سونے کی جاگہ نہیں بیدار رہو
ہم نے کردی ہے خبر تم کو خبردار رہو
لاگ اگر دل کو نہیں لطف نہیں جینے کا
الجھے سلجھے کسو کا کل کے گرفتار رہو

بارے دنیا میں رہو غمزدہ یا شاد رہو
ایسا کچھہ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

ہم کو دیوانگی شہروں ہی میں خوش آتی ہے
دشت میں قیس رہو کوہ میں فرہاد رہو

وہ گراں خواب جو ہے ناز کا اپنے سو ہے
داد بیداد رہو شب کو کہ فریاد رہو

میر ہم مل کے بہت خوش ہوے تم سے پیارے
اس خرابے میں مری جان تم آباد رہو

کہتا ہے کون میر کہ بے اختیار رو
ایسا تو رو کہ رونے پہ تیرے ہنسی نہ ہو

اے غافلان دہر یہ کچھہ راہ کی ہے بات
چلنے کو قافلے ہیں یہاں تم رہے ہو سو

حاصل کوئی اُمید ہوئی ہو تو میں کہوں
خوں ہی ہوا کئے ہیں مرے دل میں سارے چاؤ

کام کئے ہیں شوق سے ضائع صبر نہ آیا یاروں کو
مار رکھا بے تابی دل نے ہم سب غم کے ماروں کو

جو نہ ہووے نماز کرئیے نیاز
آدمی چاہئے کرے کچھہ تو

طالع و جذب و زاری و زر و زور
عشق میں چاہئے ارے کچھہ تو

سہمے سہمے نظر پڑے ہیں میر
اُس کے اطوار سے ڈرے کچھہ تو

کھلتا ہوں وہاں صحبت رندانہ جہاں ہو
میں خوش ہوں اُسی شہر سے میخانہ جہاں ہو

رهنے سے مرے پاس کے بد نام ہوے تم
اب جا کے رہو واں کہیں رسوا نہ جہاں ہو
ان اُجڑی ہوئی بستیوں میں دل نہیں لگتا
ہے جی میں وہیں جا بسیں ویرانہ جہاں ہو
وحشت ہے خرد مندوں کی صحبت سے مجھے میر
اب جا رہوں گا واں کوئی دیوانہ جہاں ہو

اپنے حسن رفتنی پر آج مت مغرور ہو
پاس تو ہے جن کے وے ہی کل کہیں گے دور ہو
دیکھ کر وہ راہ چلتا ہی نہیں تک ورنہ ہم
پاؤں اُس کے آنکھوں پر رکھ لیویں جو منظور ہو
شہر دل کی کیا خرابی کا بیاں باہم کریں
اس کو ویرانہ نہ کہئے جو کبھی معمور ہو

صوفیاں خم وا ہوے ہیں ہاے آنکھیں وا کرو
ابر آیا زور غیرت تم بھی تک پیدا کرو
مستی و دیوانگی کا عہد ہے بازار میں
پاے کوباں دست افشاں آن کر سودا کرو
گر چہ ہم پر بستہ طائر ہیں پر اے گلہاے تر
کچھ ہمیں پروا نہیں ہے تم اگر پروا کرو

اگلے سب چاہتے تھے ہم سے وفاداروں کو
کچھ تمہیں پیار نہیں کرتے جفا کاروں کو

روز دفتر لکھے گئے یاں سے
اُن نے اک حرف بھی لکھا نہ کبھو
گو شگفتہ چمن چمن تھے گل
غنچۂ دل تو وا ہوا نہ کبھو

ابتدا ھی میں مر گئے سب یار
عشق کی پائی انتہا نہ کبھو

نہ سمجھا گیا کھیل قدرت کا ہم سے
کیا اس کو بد خو بنا کر نکو رو

ھوا ابر و سبزے میں چشمک ھے گل کی
کریں ساز ہم برگ عیش لب جو

بہار آئی گل پھول سر جوڑ نکلے
رھیں باغ میں کاش اس رنگ ہم تو

رھے آبرو میر تو ھے غنیمت
کہ غارت میں دل کی ھے ایمائے ابرو

آتا نہیں نظر کہ حصول اُمید ہو
کیا تھام تھام رکھئے دل بے قرار کو

جیتے رھے تو اُس سے ہم آغوش ھوں گے ہم
لبریز گل سے دیکھیں گے جیب و کنار کو

بولا کہ مجھکو کرتی ھے بد نام گور میر
ھے خوب اگر مٹا وے کوئی اس مزار کو

موسم ابر ھو سبو بھی ھو
گل ھو گلشن ھو اور تو بھی ھو

کب تک آئینے کا یہ حسن قبول
منہ ترا اس طرف کبھو بھی ھو

ھو جو تیرا سا رنگ گل کا ھے
ریجھیں ہم تب جب ایسی بو بھی ھو

ھے غرض عشق صرف ھی لیکن
شرط یہ ھے کہ جستجو بھی ھو

سرکشی گل کی خوش نہیں آتی
ناز کرنے کو ویسا رو بھی ہو

کس کو بلبل ہے دم کشی کا دماغ
ہو تو گل ہی کی گفتگو بھی ہو

دل تمنا کدہ تو ہے پر میر
ہو تو اُس کی ہی آرزو بھی ہو

—:o:—

ردیف ہ

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
اب جو ہیں خاک انتہا ہے یہ

بود آدم نمود شبنم ہے
ایک دو دم میں پھر ہوا ہے یہ

شکر اس کی جفا کا ہو نہ سکا
دل سے اپنے ہمیں گلا ہے یہ

شور سے اپنے حشر ہے پردہ
یوں نہیں جانتا کہ کیا ہے یہ

دیکھہ بیدم لگا مجھے کہنے
ہے تو مردہ سا پر بلا ہے یہ

میر کو کیوں نہ مغتنم جانے
اگلے لوگوں میں اک رہا ہے یہ

———

ہم سے کچھہ آگے زمانے میں ہوا کیا کیا کچھہ
تو بھی ہم غافلوں نے آکے کیا کیا کیا کچھہ

کیا کہوں تجھہ سے کہ کیا دیکھا ہے تجھہ میں میں نے
عشوہ و غمزہ و انداز و ادا کیا کیا کچھہ

دل گیا ہوش گیا صبر گیا جی بھی گیا
شغل میں غم کے ترے ہم سے گیا کیا کیا کچھہ

نام ہیں خستہ و آوارہ و بدنام مرے
ایک عالم نے غرض مجھ کو کہا کیا کیا کچھ

طرفہ صحبت ہے کہ سنتا نہیں تو ایک مری
واسطے تیرے سنا میں نے سنا کیا کیا کچھ

حسرت وصل و غم ہجر و خیال رخ دوست
مر گیا میں پہ مرے جی میں رہا کیا کیا کچھ

درد دل زخم جگر کلفت غم داغ فراق
آہ عالم سے مرے ساتھ چلا کیا کیا کچھ

چشم نمناک و دل پر جگر صد پارہ
دولت عشق سے ہم پاس بھی تھا کیا کیا کچھ

تجھہ کو کیا بننے بگڑنے سے زمانے کے کہ یاں
خاک کن کن کی ہوئی اور ہوا کیا کیا کچھ

قبلہ و کعبہ خدا وند و ملاذ و مشفق
مضطرب ہوکے اُسے میں نے لکھا کیا کیا کچھ

پر کہوں کیا رقم شوق کی اپنے تاثیر
ہر سر حرف پہ وہ کہنے لگا کیا کیا کچھ

ایک محروم چلے میر ہمیں عالم سے
ورنہ عالم کو زمانے نے دیا کیا کیا کچھ

جی چاہے مل کسو سے یا سب سے تو جدا رہ
پر ہوسکے تو پیارے تک دل کا آشنا رہ

ہر مشت خاک یاں کی چاہے ہے اک تامل
بن سوچے راہ مت چل ہر گام پر کھڑا رہ

شاید کہ سر بلندی ہووے نصیب تیرے
جوں گرد راہ سب کے پاؤں سے تو لگا رہ

دوڑے بہت و لیکن مطلب کو کون پہنچا
آیندہ تو بھی ہم سا ہوکر شکستہ پا رہ

کیا موافق ہو دوا عشق کے بیمار کے ساتھہ
جی ھی جاتے نظر آتے ھیں اس آزار کے ساتھہ

رات مجلس میں تری ہم بھی کھڑے تھے چپکے
جیسے تصویر لگا دے کوئی دیوار کے ساتھہ

کس کو ہر دم ھے لہو رونے کا ھجراں میں دماغ
دل کو اک ربط سا ھے دیدہ خونبار کے ساتھہ

بندے کے درد دل کو کوئی نہیں پہنچتا
ھر ایک بے حقیقت یاں ھے خدا رسیدہ

ذوق سخن ھوا ھے اب تو بہت ھمیں بھی
لکھہ لیں گے میر جی کے کچھہ شعر چیدہ چیدہ

لطف کیا ھر کسو کی چاہ کے ساتھہ
چاہ وہ ھے جو ھو نباہ کے ساتھہ

کھینچتا ھے دلوں کو صحرا کچھہ
ھے مزاجوں میں اپنے سودہ کچھہ

ویسے ظاھر کا لطف ھے چھپنا
کم تماشا نہیں یہ پردا کچھہ

خلق کی کیا سمجھہ میں وہ آیا
آپ سے تو گیا نہ سمجھا کچھہ

کچھہ نہ دیکھا تھا ھم نے پر تو بھی
آنکھہ میں آئی ھے نہ دنیا کچھہ

وصل اس کا خدا نصیب کریں
میر جی چاھتا ھے کیا کیا کچھہ

بود نقش و نگار سا ھے کچھہ
صورت اک اعتبار سا ھے کچھہ

یہ جو مہلت جسے کہیں ہیں عمر
دیکھو تو انتظار سا ہے کچھہ

ضعف پیری میں زندگانی بھی
دوش پر اپنے بار سا ہے کچھہ

کیا ہے دیکھو ہو جو ادھر ہر دم
اور چتون میں پیار سا ہے کچھہ

اِن اجڑی بستیوں میں دیوار دورھیں کیا کیا
آثار جن کے ہیں یہ اُن کا نہیں اثر کچھہ

واعظ نہ ہو معارض نیک و بد جہاں سے
جو ہوسکے تو غافل اپنا ہی فکر کر کچھہ

یاروں کی آہ و زاری ہووے قبول کیوں کہ
ان کی زبان میں کچھہ ہے دلمیں ہے کچھہ دعا کچھہ

ہم جانتے تو عشق نہ کرتے کسو کے ساتھہ
لیجاتے دل کو خاک میں اس آرزو کے ساتھہ

نازاں ہو اس کے سامنے کیا گل کھلا ہوا
رکھتا ہے لطف ناز بھی روے نکو کے ساتھہ

گل گل شگفتہ مے سے ہے نگار دیکھہ
یک جرعہ ہمدم اور پلا بہار دیکھہ

ملتا رہا کشادہ جبیں خوب روز وشب سے
کیا آئینہ کرے ہے بسر یاں حیا کے ساتھہ

گو دست لطف سرسے اٹھا لے کوئی شفیق
دل کا لگاؤ اپنا ہے دست دعا کے ساتھہ

تدبیر دوستاں سے ہے بالعکس فائدہ
ہے درد عاشقی خصومت دوا کے ساتھہ
کیا جانوں میں چمن کو ولیکن قفس پہ میر
آتا ہے برگ گل کبھو کئی صبا کیساتھہ

:o:

ردیف ی

خانۂ دل سے زنہار نجا
کوئی ایسے مکاں سے اُٹھتا ہے
یوں اُٹھے آہ اس گلی سے ہم
جیسے کوئی جہاں سے اُٹھتا ہے

سینۂ مجروح بھی قابل ہوا ہے سیر کے
ایک دن تو آن کر یہ زخم سارے دیکھئے
خنجر بیداد کو کیا دیکھتے ہو دمبدم
چشم سے انصاف کی سینے ہمارے دیکھئے

سراپا آرزو ہونے نے بندہ کردیا ہم کو
وگر نہ ہم خدا تھے گر دل بے مدعا ہوتے
فلک اے کاش ہم کو خاک ہی رکھتا کہ اسمیں ہم
غبار راہ ہوتے یا کسو کی خاک پا ہوتے
الہی کیسے ہوتے ہیں جنہیں ہے بندگی خواہش
ہمیں تو شرم دامن گیر ہوتی ہے خدا ہوتے

کبھو وادی عشق دکھلائیے
بہت خضر بھی دل میں گمراہ ہے
جہاں سے تو رخت اقامت کو باندہ
یہ منزل نہیں بے خبر راہ ہے

دل تسلی نہیں صبا ورنہ
جلوے سب ھینگے داغ میں گل کے
سیر کر میر اس چمن کی شتاب
ھے خزاں بھی سراغ میں گل کے

قابل آغوش ستمدیدگاں
اشک سا پاکیزہ گُہر چاھئے
عشق کے آثار میں اے بوالھوس
داغ بدل دست بسر چاھئے
شرط سلیقہ ھے ھر اک امر میں
عیب بھی کرنے کو ھنر چاھئے

ھستی اپنی حباب کی سی ھے
یہ نمائش سراب کی سی ھے
نازکی اُس کے لب کی کیا کہئے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ھے
بار بار اُس کے درپہ جاتا ھوں
حالت اضطراب کی سی ھے
میں جو بولا کہا کہ یہ آواز
اُسی خانہ خراب کی سی ھے
میر ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ھے

اب جو اک حسرت جوانی ھے
عمر رفتہ کی یہ نشانی ھے
رشک یوسف ھے آہ وقت عزیز
عمر اک بار کاروانی ھے

گریہ ہر وقت کا نہیں بے ہیچ
دل میں کوئی غم نہانی ہے
اُس کی شمشیر تیز ہے ہمدم
مر رہیں گے جو زندگانی ہے

اُس کے ایفاے عہد تک نہ جیے
عمر نے ہم سے بے وفائی کی
وصل کے دن کی آرزو ہی رہی
شب نہ آخر ہوئی جدائی کی

دل کی معموری کی مت کر فکر فرصت چاہئے
ایسے ویرانے کے اب بسنے کو مدت چاہئے
عاقبت فرہاد مر کر کام اپنا کر گیا
آدمی ہووے کسی پیشے میں جرأت چاہئے
ہو طرف مجھ پہلواں شاعر کا کب عاجز سخن
سامنے ہونے کو صاحب فن کے قدرت چاہئے
عشق میں وصل و جدائی سے نہیں کچھ گفتگو
قرب و بعد اس جا برابر محبت چاہئے

تیری گلی سے جب ہم عزم سفر کریں گے
ہر ہر قدم کے اوپر پتھر جگر کریں گے
آزردہ خاطروں سے کیا فائدہ سخن کا
تم حرف سر کروگے ہم گریہ سر کریں گے
اپنے بھی جی ہے آخر انصاف کر کہ کب تک
تو یہ ستم کرے گا ہم در گزر کریں گے
صناع طرفہ ہیں ہم عالم میں ریختے کے
جو میر جی لگے گا تو سب ہنر کریں گے

یاں سرکشاں جو صاحب تاج و لوا ہوئے
پامال ہو گئے تو نہ جانا کہ کیا ہوئے
دیکھی نہ ایک چشمک گل ہی چمن میں آہ
ہم آخر بہار قفس سے رہا ہوئے
پچھتاؤگے بہت جو گئے ہم جہان سے
آدم کی قدر ہوتی ہے ظاہر جدا ہوئے
تجھ بن دماغ صحبت اہل چمن نہ تھا
گل وا ہوئے ہزار ولے ہم نہ وا ہوئے

کل میر نے کیا کیا کی مے کے لئے بیتابی
آخر کو گرو رکھا سجادۂ محرابی
جاگا کہیں وہ بھی شب مرتکب مے ہو
یہ بات سجھاتی ہے اُن آنکھوں کی بیخوابی
کیا شہر میں گنجائش مجھ بے سر و پا کو ہو
اب بڑھ گئے ہیں میرے اسباب کم اسبابی
دن رات میری چھاتی جلتی ہے محبت میں
کیا ورنہ تھی جاگہ یہ آگ جو یاں دابی
سو ملک پھرا لیکن پائی نہ وفا اک جا
جی کھا گئی ہے میرا اس جنس کی نایابی
جنگل ہی ہرے تنہا رونے سے نہیں میرے
کوہوں کی کمر تک بھی جا پہنچی ہے سیرابی
تھے ماہ وشاں کل جو ان کوٹھوں پہ جلوے میں
ہے خاک سے آج اُن کی ہر صحن میں مہتابی
کل میر جو یاں آیا، طور اُس کا بہت بھایا
وہ خشک، لبی تس پر جامہ گلے میں آبی

کہاں ہیں آدمی عالم میں پیدا
خدائی صدقے کی انسان پر سے

خوب ہے اے ابر یک شب آؤ باہم روئیے
پر نہ اتنا بھی کہ ڈوبے شہر کم کم روئیے
وقت خوش دیکھا نہ اک دم سے زیادہ دھر میں
خندۂ صبح چمن پر مثل شبنم روئیے
شادی و غم میں جہاں کی ایک سے دس کا ہے فرق
عید کے دن ہنسیئے تو دس دن محرم روئیے
دیکھا ماتم خانۂ عالم کو ہم مانند ابر
ہر جگہ پر جی میں یوں آیا دمادم روئیے
اب سے یوں کرئیے مقرر اٹھئے جب کہسار سے
وادی مجنوں پہ اے ابر اک دم روئیے

برقعے اٹھا چہرے سے وہ بت اگر آوے
الله کی قدرت کا تماشا نظر آوے
اے ناقۂ لیلیٰ دو قدم راہ غلط کر
مجنوں ز خود رفتہ کبھو راہ پر آوے
ممکن نہیں آرام دے بیتابی جگر کی
جب تک نہ پلک پر کوئی ٹکڑا نظر آوے
کہتے ہیں ترے کوچے سے میر آنے کہے ہے
جب جانئے وہ خانہ خراب اپنے گھر آوے

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے
صناع ہیں سب خوار از انجملہ ہوں میں بھی
ہے عیب بڑا اس میں جسے کچھ ہنر آوے
اے وہ کہ تو بیٹھا ہے سر راہ پہ زنہار
کہیو جو کبھو میر بلا کش ادھر آوے
مت دشت محبت میں قدم رکھہ کہ خضر کو
ہر گام پہ اس رہ میں سفر سے حذر آوے ق

حرم کو جائیے یا دیر میں بسر کرئیے
تری تلاش میں اک دل کدھر کدھر کرئیے

کٹے ہے دیکھئے یوں عمر کب تلک اپنی
کہ سنئیے نام ترا اور چشم تر کرئیے

ہوا ہے دن تو جدائی کا سو تعب سے شام
شب فراق کس امید پر سحر کرئیے

ہوں گرم سفر شام غریباں سے خوشی ہوں
اے صبح وطن تو تو مجھے بے وطنی ہے

ہر چند گدا ہوں میں ترے عشق میں لیکن
ان بوالہوسوں میں کوئی مجھہ سا بھی غنی ہے

ہر اشک مرا ہے در شہوار سے بہتر
ہر لخت جگر رشک عقیق یمنی ہے

اب کرکے فراموش تو ناشاد کروگے
پر ہم جو نہ ہوں گے تو بہت یاد کروگے

گر دیکھوگے تم طرز کلام اُس کی نظر کر
اے اہل سخن میر کو استاد کروگے

ایسی ہستی عدم میں داخل ہے
نے جواں ہم نہ طفل شیر ہوئے

یکدم تھی نمود و بود اپنی
یا سفیدی کی یا اخیر ہوئے

یعنی مانند صبح دنیا میں
ہم جو پیدا ہوئے سو پیر ہوئے

مت مل اہل دول کے لڑکوں سے
میر جی ان سے مل فقیر ہوئے

جبکہ پہلو سے یار اُٹھتا ہے
درد بے اختیار اُٹھتا ہے

اب تلک بھی مزار مجنوں سے
نا تواں ایک غبار اُٹھتا ہے

ہے بگولا غبار کس کا میر
کہ جو ہو بے قرار اُٹھتا ہے

ایک سے ہے خرمن غم دانۂ اشک ایک سے
دیدہ و دل الغرض دونوں کا حاصل ایک ہے

ہم نے بھی سیر کی تھی چمن کی، پراے نسیم
اُٹھتے ہی آشیاں سے گرفتار ہوگئے

دل عجب جائے ہے و لیکن مفت
ہاتھہ سے یہ مکان جاتا ہے

کیا خرابی ہے میکدے کی سہل
محتسب اک جہاں جاتا ہے

اس سخن ناشنو سے کیا کہئیے
غیر کی بات مان جاتا ہے

اے حب جاہ والو جو آج تاجور ہے
کل اس کو دیکھیو تم نے تاج ہے نہ سر ہے

ابکے ہوائے گل میں سیرابی ہے نہایت
جوئے چمن پہ سبزہ مژگان چشم تر ہے

اے ہم صفیر بے گل کس کو دماغ نالہ
مدت ہوئی ہماری منقار زیر پر ہے

شمع اخیر شب ہوں سن سر گزشت میری
پھر صبح ہوتے تک تو قصہ ہی مختصر ہے

اب رحم پر اُسی کے موقوف ہے کہ یاں تو
نے اشک میں سرایت نے آہ میں اثر ہے
ہر دم قدم کو اپنے رکھ احتیاط سے یاں
یہ کار گاہ ساری دکان شیشہ گر ہے

بحث ہے نا قصوں سے کاش فلک
مجھ کو اس زمرے سے نکال رکھے
سمجھے انداز شعر کو میرے
میر کا سا اگر کمال رکھے

کچھ موج ہوا پیچاں اے میر نظر آئی
شاید کے بہار آئی زنجیر نظر آئی
دلی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

پھرتے پھرتے عاقبت آنکھیں ہماری مند گئیں
سو گئے بے ہوش تھے ہم رہ کے ہارے ہوئے
پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ
اُن سے بھی تو پوچھیئے تم اتنے کیوں پیارے ہوئے

جرس راہ میں جملہ تن شور ہے
مگر قافلے سے کوئی دور ہے
تمنائے دل کے لیے جان دی
سلیقہ ہمارا تو مشہور ہے
دل اپنا نہایت ہے نازک مزاج
گرا گر یہ شیشہ تو پھر چور ہے
بہت سعی کرئیے تو مر رہئے میر
بس اپنا تو اتنا ہے مقدور ہے

گفتگو ریختے میں ہم سے نہ کر
یہ ہماری زبان ہے پیارے
شکلیں کیا کیا کیاں ہیں جن نے خاک
یہ وہی آسمان ہے پیارے
پھر تبسم کے کرنے سے تیرے
کنج لب پر گمان ہے پیارے
میر عمداً بھی کوئی مرتا ہے
جان ہے تو جہان ہے پیارے

ہر قطعۂ چمن پر تک گاڑ کر نظر کر
بگڑیں ہزار شکلیں تب پھول کے بنائے
یک حرف کی بھی مہلت ہم کو نہ دی اجل نے
تھا جی میں آہ کیا کیا پر کچھ نہ کہنے پائے
آگے بھی تجھ سے تھا یاں تصویر کا سا عالم
بیدادی فلک نے وے نقش سب مٹائے
اعجاز عشق ہی سے جیتے رہے وگرنہ
کیا حوصلہ کہ جس میں آزار یہ سمائے
دل گرمیاں انہوں کی غیروں سے جب نہ تب تھیں
مجلس میں جب گئے ہم غیرت نے جی جلائے

غالب کہ یہ دل خستہ شب ہجر میں مر جائے
یہ رات نہیں وہ جو کہانی میں گزر جائے
نہ بتکدہ ہے منزل مقصود نہ کعبہ
جو کوئی تلاشی ہو ترا آہ کدھر جائے
یاقوت کوئی ان کو کہے ہے کوئی گلبرگ
ٹک ہونٹ ہلا تو بھی کہ اک بات ٹھہر جائے
اس ورطے سے تختہ جو کوئی پہنچے کنارے
تو میر وطن میرے بھی شاید یہ خبر جائے

ہو گئی شہر شہر رسوائی
اے مری موت تو بھلی آئی
یک بیاباں برنگ صوت جرس
مجھ پہ ہے بیکسی و تنہائی
میر جب سے گیا ہے دل تب سے
میں تو کچھ ہو گیا ہوں سودائی

میں نے اس قطعۂ صناع سے سر کھینچا ہے
کہ ہر اک کوچے میں جس کے تھے ہنرور کتنے
تو ہے بیچارہ گدا میر ترا کیا مذکور
مل گئے خاک میں یاں صاحب افسر کتنے

اے شب ہجر راست کہہ تجھ کو
بات کچھہ صبح کی بھی آتی ہے
چشم بدور و چشم تر اے میر
آنکھیں طوفان کو دکھاتی ہیں

جیب اور آستیں سے رونے کا کام گزرا
سارا نچوڑ اب تو دامن پہ آرہا ہے
کاہے کا پاس اب تو رسوائی دور پہنچی
راز محبت اپنا کس سے چھپا رہا ہے

تڑپنا بھی دیکھا نہ بسمل کا اپنے
میں کشتہ ہوں انداز قاتل کا اپنے
دل زخم خوردہ کے اور اک لگائی
مدا وا کیا خوب گھائل کا اپنے
بنائیں رکھیں میں نے عالم میں کیا کیا
ہوں بندہ خیالات باطل کا اپنے

رات گزری ھے مجھے نزع میں روتے روتے
آنکھیں پھر جائیں گی اب صبح کے ھوتے ھوتے
کھول کر آنکھہ اڑا دید جہاں کا غافل
خواب ھو جاے گا پھر جاگنا سوتے سوتے

اُڑے خاک گاھے رھے گاہ ویراں
خراب و پریشاں یہاں کی طرح ھے
تعلق کرو میر اس پر جو چاھو
مری جان یہ کچھہ جہاں کی طرح ھے

حصول کام کا دلخواہ یاں ھوا بھی ھے
سماجت اتنی بھی سب سے کوئی خدا بھی ھے
اُداسیاں تھیں مری خانقہ میں قابل سیر
صنم کدے میں تو ٹک آکے دل لگا بھی ھے
یہ کہئے کیونکہ کہ خوباں سے کچھہ نہیں مطلب
لگے جو پھرتے ھیں ھم کچھہ تو مدعا بھی ھے
ترا ھے وھم کہ میں اپنے پیرھن میں ھوں
نگاہ غور سے کر مجھہ میں کچھہ رھا بھی ھے
گزار شہر وفا میں سمجھہ کے کر مجنوں
کہ اس دیار میں میر شکستہ پا بھی ھے

صید افگنوں سے ملنے کی تدبیر کریں گے
اس دل کے تئیں پیشکش تیر کریں گے
فریاد اسیران محبت نہیں بے ھیچ
یہ نالے کسو دل میں بھی تاثیر کریں گے
دیوانگی کی شورشیں دکھلائیں گے بلبل
آتی ھے بہار اب ھمیں زنجیر کریں گے

رسوائی عاشق سے تسلی نہیں خوباں
مرجاوے گا تو نعش کو تشہیر کریں گے

یارب وہ بھی دن ہوگا کہ جو مصر سے چلکر
کنعان کی طرف قافلے شبگیر کریں گے

بازیچہ نہیں میر کے احوال کا لکھنا
اس قصے کو ہم کرتے ہی تحریر کریں گے

یہ جہل دیکھہ کہ اُن سمجھے میں اُٹھا لایا
گراں وہ بار جو تھا بیش اپنی طاقت سے
جو سوچے تک تو وہ مطلوب ہم ہی نکلے میر
خراب پھرتے تھے جسکی طلب میں مدت سے

مری خلق محو کلام سب مجھے چھوڑتے ہیں خموش کب
مرا حرف رشک کتاب ہے مری بات لکھنے کا باب ہے
جو وہ لکھتا کچھہ بھی تو نامہ بر کوئی رہتی منہ میں تری زبان
تری خامشی سے یہ نکلے ہے کہ جواب خط کا جواب ہے
نہیں کھلتیں آنکھیں تمہاری تک کہ مآل پر بھی نظر کرو
یہ جو وہم کی سی نمود ہے اسےخوب دیکھو تو خواب ہے
گئے وقت آتے ہیں ہاتھہ کب ہوے ان کو گنوا کے خراب سب
تجھے کرنا ہوے سو کر تو اب کہ یہ عمر برق شتاب ہے
کبھو لطف سے نہ سخن کیا کبھو بات کہہ نہ لگا لیا
یہی لحظہ لحظہ خطاب ہے وہی لمحہ لمحہ عتاب ہے
تو جہاں کے بحر عمیق میں سر پر ہوا نہ بلند کر
کہ یہ پنج روزہ جو بود ہے کسو موج پر کا حباب ہے
رکھو آرزو مے خام کی کرو گفتگو خط جام کی
کہ سیاہ کاروں سے حشر میں نہ حساب ہے نہ کتاب ہے
مرا شور سن کے جو لوگوں نے کیا پوچھنا تو کہے ہے کیا
جسے میر کہتے ہیں صاحبو یہ وہی تو خانہ خراب ہے

روشن ہے جلکے مرنا پروانے کا و لیکن
اے شمع کچھہ تو کہہ تو تیری بھی تو زباں ہے
بھڑکے ہے آتش گل اے ابر تر ترحم
گوشے میں گلستاں کے میرا بھی آشیاں ہے
پیر مغاں! سعادت تیری جو ایسا آوے
یہ میر میکشوں میں اک طرز کا جواں ہے

دل کس طرح نہ کھینچیں اشعار ریختے کے
بہتر کیا ہے میں نے اس عیب کو ہنر سے
انجام کار بلبل دیکھا ہم اپنی آنکھوں
آوارہ تھے چمن میں دو چار ٹوٹے پر سے
بے طاقتی نے دل کی آخر کو مار رکھا
آفت ہمارے جی کی آئی ہمارے گھر سے
دلکش یہ منزل آخر دیکھا تو راہ نکلی
سب یار جا چکے تھے آے جو ہم سفر سے

ناصح کو خبر کیا ہے لذت سے غم دل کی
ہے حق بطرف اُس کے چکھے تو مزا جانے
بے طاقتی دل نے ہم کو نہ کیا رسوا
ہے عشق مزا اس کو جو کوئی چھپا جانے

نالۂ عجز نقص الفت ہے
رنج و محنت کمال راحت ہے
تا دم مرگ غم خوشی کا نہیں
دل آزردہ گر سلامت ہے
تیرا شکوہ مجھے نہ میرا تجھے
چاہئے یوں جو فی الحقیقت ہے

تجھہ کو مسجد ہے مجھہ کو مے خانہ
واعظا اپنی اپنی قسمت ہے

تربت میر پر ہیں اہل سخن
ہر طرف حرف ہے حکایت ہے

تو بھی تقریب فاتحہ سے چل
بخدا واجب الزیارت ہے

سچ پوچھو تو کب ہے گا اُس کا سا دہن غنچہ
تسکیں کے لئے ہم نے اک بات بنا لی ہے

میر میں جیتوں میں آوں گا اسی دن جس دن
دل نہ تڑپے گا مرا چشم نہ بھر آئیگی

اس فن میں کوئی بے تہ کیا ہو امرا معارض
اول تو میں سند ہوں پھر یہ مری زباں ہے

طرف ہونا مرا مشکل ہے میر اس شعر کے فن میں
یونہی سودا کبھو ہوتا ہے سو جاہل ہے کیا جانے

کیا کروں شرح خستہ جانی کی
میں نے مر مر کے زندگانی کی

حال بد گفتنی نہیں میرا
تم نے پوچھا تو مہربانی کی

سب کو جانا ہے یوں تو پر اے صبر
آتی ہے اک تری جوانی کی

بیت بخشی سمجھہ کے کر بلبل
دھوم ہے میری خوش زبانی کی

جس سے کھوئی تھی نیند میر نے کل
ابتدا پھر وھی کہانی کی

کچھہ تو کہہ وصل کی پھر رات چلی جاتی ھے
دن گزر جائیں ھیں پر بات چلی جاتی ھے
رہ گئے گاہ تبسم پہ گہے بات ھی پر
بارے اے ھمنشیں اوقات چلی جاتی ھے
روز آنے پہ نہیں نسبت عشقی موقوف
عمر بھر ایک ملاقات چلی جاتی ھے
خرقہ مندیل وردا مست لئے جاتے ھیں
شیخ کی ساری کرامات چلی جاتی ھے

تم نے جو اپنے دل سے بھلا یا ھمیں تو کیا
اپنے تئیں تو دل سے ھمارے بھلائیے
پہنچا تو ھوگا سمع مبارک میں حال میر
اس پر بھی جی میں آوے تو دل لگائیے

خانقہ کا تو نہ کر قصد تک اے خانہ خراب
یہی اک رہ گئی ھے بستی مسلمانوں کی
دل ودیں کیسے کہ اُس رھزن دلہا سے اب
یہ پڑی ھے کہ خدا خیر کرے جانوں کی
سرگزشتیں نہ مری سن کہ اچٹتی ھے نیند
خاصیت یہ ھے مری جان ان افسانوں کی
میکدے سے تو ابھی آیا ھے مسجد میں میر
ھو نہ لغزش کہیں مجلس ھے یہ بیگانوں کی

نہیں وسواس جی گنوانے کے
ھاے رے ذوق دل لگانے کے

میرے تغییر حال پر مت جا
اتفاقات ہیں زمانے کے

دم آخر ہی کیا نہ آنا تھا
اور بھی وقت تھے بہانے کے

اس کدورت کو ہم سمجھتے ہیں
ڈھب ہیں یہ خاک میں ملانے کے

دل و دیں ہوش و صبر سب ہی گئے
آگے آگے تمہارے آنے کے

رہی نہ گفتہ مرے دل میں داستاں میری
نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری

برنگ صوت جرس تجھ دور سے ہوں تنہا
خبر نہیں ہے تجھے آہ کارواں میری

ترے نہ آج کے آنے میں صبح کے مجھ پاس
ہزار جائے گئی طبع بدگماں میری

شب اس کے کوچے میں جاتا ہوں اس توقع پر
کہ ایک دوست ہے واں خواب پاسباں میری

اُسی سے دور رہا اصل مدعا جو تھا
گئی یہ عمر عزیزا آہ رائیگاں میری

ترے فراق میں جیسے خیال مفلس کا
گئی ہے فکر پریشاں کہاں کہاں میری

دل کو مت بھول جانا میرے بعد
مجھ سے یہ یادگار رہتا ہے

دور میں چشم مست کے تیری
فتنہ بھی ہوشیار رہتا ہے

آج کل بے قرار هیں هم بهی
بیٹھه جا چلنے هار هیں هم بهی
آن میں کچھه هیں آن میں کچھه هیں
تحفۂ روزگار هیں هم بهی
منع گریه نه کر تو اے ناصح
اس میں بے اختیار هیں هم بهی

غفلت میں گئی آه مری ساری جوانی
اے عمر گزشته میں تیری قدر نه جانی
دیکھیں توسهی کب تئیں نبهتی هے یه محبت
هم جی سے ترے دوست هیں تو دشمن جانی
اک شخص مجهی سا تهاکه وه تجهه په تها عاشق
وه اس کی وفا پیشگی وه اُس کی جوانی
یه کهه کے جو رویا تو لگا کهنے نه کهه میر
سنتا نهیں میں ظلم رسیدوں کی کهانی

9

فقیرانه آے صدا کر چلے
میاں خوش رهو هم دعا کر چلے
وه کیا چیز هے آه جس کے لئے
هر اک چیز سے دل اُٹھا کر چلے
کوئی نا امیدانه کر کے نگاه
سو تم هم سے منه بهی چهپا کر چلے
دکهائی دئیے یوں که بے خود کیا
همیں آپ سے بهی جدا کر چلے
جبیں سجدے کرتے هی کرتے گئی
حق بندگی هم ادا کر چلے
پرستش کی یاں تک اے بت تجهے
نظر میں سبهوں کی خدا کر چلے

گئی عمر در بند فکر غزل
سو اس فن کو ایسا بڑا کر چلے
کہیں کیا جو پوچھے کوئی ہم سے میر
جہاں میں تم آے تھے کیا کر چلے

کل بارے ہم سے اُس سے ملاقات ہوگئی
دو دو بچن کے ہونے میں ایک بات ہوگئی
ڈر ظلم سے کہ اس کی جزا بس شتاب ہے
آیا عمل میں یاں کہ مکافات ہوگئی
خورشید سا پیالہ مئے بے طلب دیا
پیر مغاں سے رات کرامات ہوگئی
اپنے تو ہونٹ بھی نہ ہلے اس کے رو برو
رنجش کی وجہ میر وہ کیا بات ہوگئی

کوئی ہو محرم شوخی ترا تو میں پوچھوں
کہ بزم عیش جہاں کیا سمجھ کے برہم کی

جس جگہ دور جام ہوتا ہے
واں یہ عاجز مدام ہوتا ہے
ہم تو اک حرف کے نہیں ممنوں
کیسا خط و پیام ہوتا ہے
پوچھہ مت آہ عاشقوں کی معاش
روز اُن کا بھی شام ہوتا ہے
زخم بن غم بن اور غصے بن
اپنا کھانا حرام ہوتا ہے
میر صاحب بھی اُس کے ہاں تھے پر
جیسے کوئی غلام ہوتا ہے

حسرت لطف عزیزاں چمن جی میں رہی
سر پہ دیکھا نہ گل و سرو کا سایہ ہم نے
بعد اک عمر کہیں تم کو جو تنہا پایا
ڈرتے ڈرتے ہی کچھہ احوال سنایا ہم نے
یاں فقط ریختہ ہی کہنے نہ آئے تھے ہم
چار دن یہ بھی تماشا سا دکھایا ہم نے

نسبت تو دیتے ہیں ترے لب سے پر ایک دن
ناموس یوں ہی جائے گی آب حیات کی
صد حرف زیر خاک تہ دل چلے گئے
مہلت نہ دی اجل نے ہمیں ایک بات کی
ہم تو ہی اس زمانے میں حیرت سے چپ نہیں
اب بات جاچکی ہے سبھی کائنات کی

کرو توکل کہ عاشقی میں نہ یوں کروگے تو کیا کروگے
الم جو یہ ہے تو دردمندو! کہاں تلک تم دوا کروگے
جگر میں طاقت کہاں ہے اتنی کہ درد ہجراں سے مرتے رہئیے
ہزاروں وعدے وصال کے تھے کوئی بھی جیتے وفا کروگے
اخیر الفت یہی نہیں ہے کہ جل کے آخر ہوئے پتنگے
ہوا جو یاں کی یہ ہے تو یارو غبار ہو کر اُڑا کروگے

مصائب اور تھے پر دل کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہوگیا ہے
سرھانے میر کے آہستہ بولو
ابھی تک روتے روتے سوگیا ہے

پھر ہم رہے شرابی سے
دل پر خوں کی اک گلابی سے

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ھے
اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے
کام تھے عشق میں بہت پر میر
ہم ھی فارغ ھوئے شتابی سے

ھر کوئی اس مقام پر دس روز
اپنی نوبت بجائے جاتا ھے
جائے عبرت ھے خاکدان جہاں
تو کہاں منہ اُٹھائے جاتا ھے
دیکھہ سیلاب اس بیاباں کا
کیسا سر کو جھکائے جاتا ھے

کعبے میں جاں بلب تھے ہم دوری بتاں سے
آئے ھیں پھر کے یارو اب کے خدا کے ھاں سے
جب کوندھتی ھے بجلی تب جانب گلستاں
رکھتی ھے چھیڑ میرے خاشاک آشیاں سے
کیا خوبی اُس کے منہ کی اے غنچہ نقل کرئیے
تو تو نہ بول ظالم بو آتی ھے دھاں سے
خاموشی ھی میں ہم نے دیکھی ھے مصلحت اب
ہر اک سے حال دل کا مدت کہا زباں سے
اتنی بھی بد مزاجی ہر لحظہ میر تم کو
الجھاؤ ھے زمیں سے جھگڑا ھے آسماں سے

ہم گو نہ ھوں جہاں میں آخر جہاں تو ھوگا
تو نے بدی تو کی ھے ظالم بھلا کیا ھے

گرداب وار یار ترے صدقے جائیے
دریا کا پھیر پائیے تیرا نہ پائیے

جو کفر جانتے تھے عشق بتاں کو وہ ھی
مسجد کے آگے آخر قشقہ لگا کے بیٹھے
کیا اپنی اور اُس کی اب نقل کرئیے صحبت
مجلس سے اُٹھ گیا وہ تک ھم جو آ کے بیٹھے

شاید ب تکروں نے دل کے قصد آنکھوں کا کیا
کچھہ سبب تو ھے جو آنسو آتے آتے تھم گئے
کیا معاش اس غمکدے میں ھم نے دس دن کی بہم
اُٹھہ کے جس کے ھاں گئے دل کا لئے ماتم گئے
ربط صاحب خانہ سے مطلق بہم پہنچا نہ میر
مدتوں سے ھم حرم میں تھے پہ نا محرم گئے

تم چھیڑتے ھو بزم میں مجھہ کو تو ھنسی سے
پر مجھہ پہ جو ھو جائے ھے پوچھو مرے جی سے

کیا رنگ و بو و باد سحر سب ھیں گرم راہ
کیا ھے جو اس چمن میں ھے ایسی چلا چلی

تم نہیں فتنہ ساز سچ صاحب
شہر پر شور اس غلام سے ھے
کوئی تجھہ سا بھی کاش تجھہ کو ملے
مدعا ھم کو انتقام سے ھے
شعر میرے ھیں سب خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ھے
سہل ھے میر کا سمجھنا کیا
ھر سخن اس کا اک مقام سے ھے

وہ جو پھرتا ھے مجھہ سے دور ھی دور
ھے یہ تقریب جی کے جانے کی

———

کس کو کہتے ھیں نہیں میں جانتا اسلام و کفر
دیر ھو یا کعبہ مطلب مجھکو تیرے در سے ھے
رحم بھی دینا تھا تھوڑا ھاے اس خوبی کے ساتھہ
تجھہ سے کیا کل گفتگو یہ داور محشر سے ھے
کیا کروں گا ابکے میں بے پر ھوس گلزار کی
لطف گلگشت اے نسیم صبح بال و پر سے ھے

———

چھاتی جلا کرے ھے سوز دروں بلا ھے
اک آگ سی رھے ھے کیا جانئے کہ کیا ھے
میں اور تو ھیں دونوں مجبور طور اپنے
پیشا ترا جفا ھے شیوہ مرا وفا ھے
روئے سخن ھے کیدھر اھل جہاں کا یارب
سب متفق ھیں اس پر ھر ایک کا خدا ھے
پھرتے ھو میر صاحب سب سے جدے جدے تم
شاید کہیں تمہارا دل اندنوں لگا ھے

———

اُس شوخ ستمگر کو کیا کوئی بھلا چاھے
جو چاھنے والے کا ھر طور برا چاھے
کعبے گئے کیا کوئی مقصد کو پہنچتا ھے
کیا سعی سے ھوتا ھے جب تک نہ خدا چاھے
دل جانے ھے جوں روکر شبنم نے کہا گل سے
اب ھم تو چلے یاں سے رہ تو جو رھا چاھے

———

ھم طور عشق سے تو واقف نہیں ھیں لیکن
سینے میں جیسے دل کو کوئی ملا کرے ھے

کیا کہئے داغ دل ہے ٹکڑے جگر ہے سارا
جانے وہی جو کوئی ظالم وفا کرے ہے

یار بن تلخ زندگانی تھی
دوستی مدعی جانی تھی

لطف پر اس کے ہمنشیں مت جا
کبھو ہم پر بھی مہربانی تھی

شیب میں فائدہ تامل کا
سوچنا تب تھا جب جوانی تھی

میرے قصے سے سب کی نیندیں گئیں
کچھ عجب طور کی کہانی تھی

عاشقی جی ہی لے گئی آخر
یہ بلا کوئی ناگہانی تھی

کوئے قاتل سے بچ کے نکلا خضر
اسی میں اس کی زندگانی تھی

فقر پر بھی تھا میر کے اک رنگ
کفنی پہنی سو زعفرانی تھی

جفا اس کی نہ پہنچی انتہا کو
دریغا عمر نے کی بے وفائی

سارے دکھوں کی اے دل ہو جائیگی تلافی
صحبت ہماری اُس کی تک بھی اگر بنے ہے

برسوں لگی ہوئی ہیں جب مہر و مہ کی آنکھیں
تب کوئی ہم سا صاحب صاحب نظر بنے ہے

یاران دیر و کعبہ دونوں بلا رہے ہیں
اب دیکھیں میر اپنا جانا کدھر بنے ہے

میر دریا ہے سنئے شعر زبانی اُس کی
اللہ اللہ رے طبیعت کی روانی اُس کی

ایک ہے عہد میں اپنے وہ پراگندہ مزاج
اپنی آنکھوں میں نہ آیا کوئی ثانی اس کی

مینہ تو بوچھار کا دیکھا ہے برستے تم نے
اسی انداز سے تھی اشک نشانی اس کی

بات کی طرز کو دیکھو تو کوئی جادو تھا
پر ملی خاک میں سحر بیانی اُس کی

اُس کا وہ عجز تمہارا یہ غرور خوبی
منتیں اُس نے بہت کیں پہ نہ مانی اُس کی

سرگذشت آپ ہی کس اند وہ سے سب کہتا تھا
سو گئے تم نہ سنی ہائے کہانی اُس کی

مرثیے دل کے لکھی کہہ کے دیئے لوگوں کو
شہر دلی میں ہے سب پاس نشانی اُس کی

آبلے کی سی طرح ٹھیس لگی پھوٹ بہے
دردمندی میں گئی ساری جوانی اُس کی

اب گئے اسکے جز افسوس نہیں کچھہ حاصل
حیف صد حیف کہ کچھہ قدر نہ جانی اُس کی

مزاجوں میں یاس آگئی ہے ہمارے
نہ مرنے کا غم ہے نہ جینے کی شادی

باؤلے سے جب تلک بکتے تھے سب کرتے تھے پیار
عقل کی باتیں کیاں کیا ہم سے نادانی ہوئی

مقدور تک تو ضبط کروں ہوں پہ کیا کروں
منہ سے نکل ہی جاتی ہے اک بات پیار کی

تھا ملک جن کے زیر نگیں صاف مٹ گئے
تم اس خیال میں ہو کہ نام و نشاں رہے

جو خواہش نہ ہوتی تو کاہش نہ ہوتی
ہمیں جی سے مارا تری آرزو نے
نہ بھائیں تجھے مری باتیں وگرنہ
رکھی دھوم شہروں میں اس گفتگو نے
وہ کسریٰ کہ ہے شور جس کا جہاں میں
پڑے ہینگے اس کے محل آج سونے
تری چال ٹیڑھی تری بات روکھی
تجھے میر سمجھا ہے یاں کم کسو نے

نو گرفتار ہوں اس باغ کا رحم اے صیاد
موسم گل رہے جب تک مجھے مہلت دیجے
اپنے ہی دل کا گنہ ہے جو جلاتا ہے مجھے
کس کو لے مرئیے میاں اور کسے تہمت دیجے

مرگ مجنوں سے عقل گم ہے میر
کیا دوانے موت پائی ہے

ہر طرف بحث تجھ سے ہے اے عشق
شکر تیرا تیری شکایت ہے
مت مراعات غیر رکھ منظور
مرے حق میں یہی رعایت ہے

سر کسو سے فرو نہیں آتا
حیف بندے ہوئے خدا نہ ہوئے

جی کے لگنے کی میر کچھہ کہہ بھی
ھے وھی بات جس میں ھو یہ بھی
حسن اے رشک مہ نہیں رھتا
چار دن کی ھے چاندنی یہ بھی

کرتی پھرے ھے رسوا سارے چمن میں مجھکو
گر کوئی بات دل کی بلبل سے میں کہی ھے
ھے صبح کا سا عرصہ پیری کا اس میں کیا ھووے
باقی ھے وقت کتنا فرصت کہاں رھی ھے
چاھت اس طرح کی جز میر کس سے ھووے
باور نہیں تو دیکھو یہ ھو نہ ھو وھی ھے

اس کا غضب سے نامہ نہ لکھنا تو سہل ھے
لوگوں کے پوچھنے کا کوئی کیا جواب دے

نقد دل غفلت سے کھو یا راہ کھوتی کر گئے
کارواں جاتا رھا ھم خواب ھی میں مر گئے
کیا کہیں اس نے جو پھیرا اپنے در پر سے ھمیں
مر گئے غیرت سے ھم بھی پر نہ اُس کے گھر گئے
واعظ ناکس کی باتوں پر کوئی جاتا ھے میر
آؤ میخانے چلو تم کس کے کہنے پر گئے

اے کاش کوئی جاکر کہہ آوے یار سے بھی
یاں کام جاچکا ھے اب اختیار سے بھی
جان وجہاں سے گزرا میں میر جن کی خاطر
بچکر نکلتے ھیں وے میرے مزار سے بھی

حرف شنو ساتھ اپنے نہیں ہیں ورنہ درائے قافلہ ساں
راہ میں باتیں کس کس ڈھب کی کرتے ہیں ہم یاروں سے
خستہ ہو اپنا کیسا ہی کوئی پھر بھی گلے سے لگاتے ہیں
وحشت ایک تمہیں کو دیکھی اپنے سینہ فگاروں سے

کچھ نہیں اور دیکھیں ہیں کیا کیا
خواب کا سا ہے یاں کا عالم بھی

باغ میں سیر کبھو ہم بھی کیا کرتے تھے
روش آب رواں پہیلے پھیرا کرتے تھے
غیرت عشق کسو وقت بلا تھی ہم کو
تھوڑي آزردگی میں ترک وفا کرتے تھے
دل کی بیماری سے خاطر تو ہماری تھی جمع
لوگ کچھ یوں ہی محبت سے دوا کرتے تھے
جب تلک شرم رہی مانع شوخی اس کی
تب تلک ہم بھی ستم دیدہ حیا کرتے تھے
مائل کفر جوانی میں بہت تھے ہم لوگ
دیر میں مسجدوں میں دیر رہا کرتے تھے
اب تو بیتابی دل نے ہمیں بٹھلا ہی دیا
آگے رنج و تعب عشق اٹھا کرتے تھے
اُٹھ گئے پر مرے تکئے کو کہیں گے یاں میر
درد دل بیٹھے کہانی سی کہا کرتے تھے

دنیا کی قدر کیا جو طلب گار ہو کوئی
کچھ چیز مال ہو تو خریدار ہو کوئی
کیا ابر رحمت اب کے برسنا ہے لطف سے
طاعت گزیں جو ہو سو گنہگار ہو کوئی

هم عاشقان زرد و زبون و نزار سے
مت کر ادائیں ایسی کہ بیزار ہو کوئی

چلو چمن میں جو دل کھلے تک بہم غم دل کہا کرینگے
طیور ہی سے بکا کریں گے گلوں کے آگے بکا کریں گے

سنو سرگزشت اب ہماری زبانی
سنی گرچہ جاتی نہیں یہ کہانی
ملا دیتی ہے خاک میں آدمی کو
محبت ہے کوئی بلا آسمانی
گرامی گہر میر جی تھا ہمارا
ولے عشق میں قدر ہم نے نجانی

چلتے ہو تو چمن کو چلئے سنتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں پھول کھلے ہیں کم کم باد و باراں ہے

آگے کسو کے کیا کریں دست طمع دراز
وہ ہاتھہ سو گیا ہے سرھانے دھرے دھرے

اڑنے کی یک ہوس ہے ہم کو قفس سے ورنہ
شائستۂ پریدن بازو میں پر کہاں ہے

فرہاد و قیس گزرے اب شور ہے ہمارا
ہر کوئی اپنی نوبت دو دن بجا گیا ہے

اے میر شعر کہنا کیا ہے کمال انساں
یہ بھی خیال سا کچھہ خاطر میں آگیا ہے

شاعر نہیں جو دیکھا تو تو ھے کوئی ساحر
دو چار شعر پڑھ کر سب کو رجھا گیا ھے

پیدا کہاں ھے ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رھی

دل کی بات کہی نہیں جاتی چپکے رھنا ٹھانا ھے
حال اگر ھے ایسا ھی تو جی سے جانا جانا ھے
فرصت کم ھے یاں رھنے کی بات نہیں کچھہ کہنے کی
آنکھیں کھول کے کان جو کھولو بزم جہاں افسانا ھے
فائدہ ھوگا کیا مترتب ناصح ھرزہ درائی سے
کس کی نصیحت کون سنے ھے عاشق تو دیوانا ھے
تیغ تلے ھی اُس کے کیوں نہ گردن ڈال کے جا بیٹھیں
سر تو آخر کار ھمیں بھی خاک کے اور جھکانا ھے

میں اس کی جدائی میں تصدیع بہت پائی
درویشی و کم پائی بے صبری و تنہائی
تھا صبر و سکوں جب تک رھتا تھا مجھے غش سا
بیتابی دل سر پر اِک اور بلا لائی ھے

بوئے گل یا نوائے بلبل تھی
عمر افسوس کیا شتاب گئی

مجھہ کو مارا بھلا کیا تو نے
پر وفا کا برا کیا تو نے
حسرتیں اس کی سر پٹکتی ھیں
مرگ فرھاد کیا کیا تو نے

آنکھوں کی طرف گوش کی در پردہ نظر ہے
کچھہ یار کے آنے کی مگر گرم خبر ہے

یہ راہ روش سرو گلستاں میں نہ ہوگی
اس قامت دلچسپ کا انداز دگر ہے

وہ ناوک دل دوز ہے لاگو مرے جی کا
تو سامنے ہو ہمدم اگر تجھہ کو جگر ہے

کیا جان کہ جس کے لئے منہ موڑئیے تم سے
تم آؤ چلے داعیہ کچھہ تم کو اگر ہے

شب شور و فغاں کرتے گئی مجھہ کو تو اب تو
دلکش ہو تک اے مرغ چمن وقت سحر ہے

سوچے تھے کہ سودائے محبت میں ہے کچھہ سود
اب دیکھتے ہیں اس میں تو جی ہی کا ضرر ہے

شانے پہ رکھا ہار جو پھولوں کا تو لچکے
کیا ساتھہ نزاکت کے رگ گل سی کمر ہے

کر کام کسو دل میں گئی عرش پہ تو کیا
اے آہ سحر گاہ اگر تجھہ میں اثر ہے

ہر بیت میں کیا میر تری باتیں گتھی ہیں
کچھہ اور سخن کرکہ غزل سلک گہر ہے

کیا خانہ خرابی کا ہمیں خوف و خطر ہے
گھر ہے کسو گوشے میں تو مکڑی کا سا گھر ہے

اے شمع اقامت کدہ اس بزم کو مت جان
روشن ہے ترے چہرے سے تو گرم سفر ہے

اس عاشق دیوانہ کی مت پوچھہ معیشت
دنداں بجگر دست بدل داغ بسر ہے

کیا آگ کی چنگاریاں سینے میں بھری ہیں
جو آنسو مری آنکھہ سے گرتا ہے شرر ہے

درجان کا جس جا ہے وہیں گھر بھی ہے اپنا
ہم خانہ خرابوں کو نہ یاں گھر ہے نہ در ہے

بزم میں سے اب تو چل اے رشک صبح
شمع کے اوپر پھری ہے مردنی
میں چراغ صبحگاہی ہوں نسیم
مجھ سے اکدم کے لئے کیا دشمنی

نہ بک شیخ اتنا بھی واہی تباہی
کہاں رحمت حق کہاں بیگناہی
مجھے میر تا گور کاندھا دیا تھا
تمنائے دل نے تو یاں تک نباہی

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے
مہر و وفا و لطف و عنایت ایک سے واقف ان میں سے
اور تو سب کچھ طنز و کنایہ رمز و اشارہ جانے ہے

ملواں دنوں ہم سے اک رات جانی
کہاں ہم کہاں تم کہاں پھر جوانی
شکایت کروں ہوں تو سونے لگے ہے
مری سرگزشت اب ہوئی ہے کہانی
ادا کھینچ سکتا ہے بہزاد اُس کی
کھنچے صورت ایسی تو یہ ہم نے مانی
ملاقات ہوتی ہے تو کشمکش سے
یہی ہم سے ہے جب نہ تب اینچا تانی

عالم عالم عشق و جنون ہے دنیا دنیا تہمت ہے
دریا دریا روتا ہوں میں صحرا صحرا وحشت ہے

ہائے غیوری جس کی دیکھی جی ہی نکلتا ہے اپنا
دیکھتے اس کی اور نہیں پھر عشق کی یہ بھی غیرت ہے

صبح سے آنسو نومیدانہ جیسے وداعی آتا تھا
آج کسو خواہش کی شاید دل سے ہمارے رخصت ہے

کیا دلکش ہے بزم جہاں کی جاتے یاں سے جسے دیکھو
وہ غمدیدہ رنج کشیدہ آہ سراپا حسرت ہے

آب حیات وہی نہ جس پر خضر و سکندر مرتے رہے
خاک سے ہم نے بھرا وہ چشمہ یہ بھی ہماری ہمت ہے

گلستاں کے ہیں دونوں پلے بھرے
بہار اس طرف اُس طرف ابر ہے

درکعبہ پر کفر بکتا ہے میر
مسلماں نہیں وہ کہیں گبر ہے

اپنے نیاز تم سے ابتک بتاں رہے تھے
تم ہو خدائے باطل ہم بندے ہیں تمہارے

ٹھہرے ہیں ہم تو مجرم ٹک پیار کرکے تم کو
تم سے بھی کوئی پوچھے تم کیوں ہوئے پیارے

کل میں جو سیر میں تھا کیا پھول پھول بیٹھے
بلبل نے لی ہے گویا گلزار سب اجارے

کرتا ہے ابر نیساں پر در دہن صدف کا
منہ جو کوئی پسارے ایسے کئے پسارے

ہوتی ہے صبح جو یاں ہے شام سے بھی بدتر
کیا کہئے میر خوبی ایام کی ہمارے

داد فریاد جا بجا کرئیے
شاید اس کے بھی دل میں جا کرئیے

دیکھیں کب تک رہے ہے یہ صحبت
گالیاں کھائیے دعا کرئیے

کچھ کہیں تو کہے ہے یہ نہ کہو
کیونکر اظہار مدعا کرئیے

راہ تکنے کو بھی نہایت ہے
منتظر کب تلک رہا کرئیے

ہستی موہوم و یک سر و گردن
سیکڑوں کیونکہ حق ادا کرئیے

وہ نہیں سرگزشت سنتا میر
یوں کہاں سی کیا کہا کرئیے

مترتب ہو نفع جو کچھ بھی
دل کی بیماری کی دوا کرئیے

نالہ جب گرم کار ہوتا ہے
دل کلیجے کے پار ہوتا ہے

سب مزے در کنار عالم کے
یار جب ہم کنار ہوتا ہے

جبر ہے قہر ہے قیامت ہے
دل جو بے اختیار ہوتا ہے

اس صنایع کا اس بدایع کا
کچھ تعجب نہیں خدائی ہے

نہ تو جذب رسا نہ بخت رسا
کیوں کہ کہئے کہ واں رسائی ہے

میں نہ آتا تھا باغ میں اُس بن
مجھ کو بلبل پکار لائی ہے

گل قفس تک نسیم لائی ھے
لو کہ پھر کر بہار آئی ھے

عشق دریا ھے ایک لنگر دار
تہ کسو نے بھی اسکی پائی ھے

وہ نہ شرماوے کب تلک آخر
دوستی یاری آشنائی ھے

وے نہیں تو اُنہوں کا بھائی اور
عشق کرنے کی کیا منائی ھے

یارب کوئی دیوانہ بے ڈھنگ سا آجاوے
اغلال و سلاسل تک اپنی بھی ھلا جاوے

خاموش رھیں کب تک زندان جہاں میں ھم
ھنگامہ قیامت کا شورش سے اُٹھا جاوے

عاشق میں ھے اور اس میں نسبت سگ و آھو کی
جوں جوں ھو رمیدہ وہ توں توں یہ لگا جاوے

کہئے جہاں کرتا ھو تاثیر سخن کچھہ بھی
وہ بات نہیں سنتا کیا اُس سے کہا جاوے

ھم دیر کے جنگل میں بھولے پھرے ھیں کبتک
کعبے کا ھمیں رستہ خضر آکے بتا جاوے

ترے بندے ھم ھیں خدا جانتا ھے
خدا جانے تو ھمکو کیا جانتا ھے

نہیں عشق کا درد لذت سے خالی
جسے ذوق ھے وہ مزا جانتا ھے

کبھے زیر برقع کبھے گیسوؤں میں
غرض خوب وہ منہ چھپا جانتا ھے

مجھے جانے ھے آپ سا ھی فریبی
دعا کو بھی میری دغا جانتا ھے

جفا اس پہ کرتا ھے حد سے زیادہ
جنہیں یار اهل وفا جانتا ھے

لگا لے ھے جھمکے دکھا کے اُسی کو
جسے مغبچہ پارسا جانتا ھے

اُسے جب نہ تب هم نے بگڑا ھی پایا
یہی اچھے منہ کو بنا جانتا ھے

بلا شور انگیز ھے چال اُس کی
اُسی طرز کو خوش نما جانتا ھے

نہ گرمی جلاتی تھی ایسی نہ سردی
مجھے یار جیسا جلا جانتا ھے

مرے دل میں رهتا ھے تو ھی تبھی تو
جو کچھہ دل کا ھے مدعا جانتا ھے

جہاں میر عاشق هوا خوار ھی تھا
یہ سودائی کب دل لگا جانتا ھے

یہی عشق ھی جی کھپا جانتا ھے
کہ جاناں سے بھی جی ملا جانتا ھے

بدی میں بھی کچھہ خوبی هوویگی تب تو
برا کرنے کو وہ بھلا جانتا ھے

مرا شعر اچھا بھی دانستہ ضد سے
کسو اور ھی کا کہا جانتا ھے

زمانے کے اکثر ستمگار دیکھے
وھی خوب طرز جفا جانتا ھے

دم میں جب تلک تھا سوچ رھا
سانس کے ساتھہ سارے سانسے گئے

یار نے ہم سے بے ادائی کی
وصل کی رات میں لڑائی کی

بال و پر بھی گئے بہار کے ساتھہ
اب توقع نہیں رھائی کی

خندۂ یار سے طرف ھو کر
برق نے اپنی جگ ھنسائی کی

کوھکن کیا پہاڑ توڑے گا
عشق نے زور آزمائی کی

چپکے اس کی گلی میں پھرتے رھے
دیر واں ھم نے بے نوائی کی

میر کی بندگی میں جانبازی
سیر سی ھوگئی خدائی کی

نہ وے لوگ ھیں اب نہ اجماع وہ
جہاں وہ نہیں یہ جہاں اور ھے

نہ ان لوگوں کی بات سمجھی گئی
یہ خلق اور اُن کی زباں اور ھے

تجھے گو کہ صد رنگ ھو مجھہ سے کیں
مرے اُور اک مہرباں اور ھے

ھوا رنگ بدلے ھے ھر آن میر
زمیں و زماں ھر زماں اور ھے

کہو تو کب تئیں یوں ساتھہ تیرے پیار رھے
کہ دیکھہ جب تجھے تب جی کو مار مار رھے

ھوس اسیروں کے تک دل کی نکلے کچھہ شاید
کوئی دن اور اگر موسم بہار رھے

اٹھا جو باغ سے میں بے دماغ تو نہ پھرا
ھزار مرغ گلستاں مجھے پکار رھے

وصال و ہجر تھہر جاوے کچھہ نہ کچھہ آخر
جو بے قرار مرے دل کو بھی قرار رہے

جب سے جہاں ہے تب سے خرابی یہی ہے میر
تم دیکھہ کر زمانے کو حیران کیا رہے

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

گل نے کہا بہت کہ چمن سے نجائیے
گلگشت کو جو آئیے آنکھوں پر آئیے
میں بے دماغ کر کے تغافل چلا گیا
وہ دل کہاں کہ ناز کسو کے اُٹھائیے
صحبت عجب طرح کی پڑی اتفاق ہائے
کھو بیٹھئے جو آپ کو تو اس کو پائیے
خاطر ہی کے علاقے کی سب ہیں خرابیاں
اپنا ہو بس تو دل نہ کسو سے لگائیے
اے ہمدم ابتدا سے ہے آدم کشی میں عشق
طبع شریف اپنی نہ ایدھر کو لائیے
اتنی بھی کیا ہے دیدہ درائی کہ غیر سے
آنکھیں لڑائیے ہمیں آنکھیں دکھائیے
مچلا ہے وہ تو دیکھہ کے لیتا ہے آنکھیں موند
سوتا پڑا ہو کوئی تو اُس کو جگائیے

دل میں مسودے تھے بہت پر حضور یار
نکلا نہ ایک حرف بھی میری زبان سے
اول زمینیوں میں ہو مائل میری طرف
جو حادثہ نزول کرے آسمان سے

وہ دل نہیں رہا ہے نہ وہ اب دماغ ہے
جی تن میں اپنے بجھتا سا کوئی چراغ ہے
یارب رکھینگے پنبۂ مرہم کہاں کہاں
سوز دروں سے ہائے بدن داغ داغ ہے
مدت ہوئی کہ زانو سے اُٹھتا نہیں ہے سر
کڑھنے سے رات دن کے ہمیں کب فراغ ہے
گھر گھر پھرے ہے جھانکتی ہر صبح جو نسیم
پردے میں کوئی ہے کہ یہ اس کا سراغ ہے

طبیعت نے عجب کل یہ ادا کی
کہ ساری رات وحشت ہی رہا کی
نمایش داغ سودا کی ہے سر سے
بہار اب ہے جنون کی ابتدا کی
مجھی کو ملنے کا ڈھب کچھہ نہ آیا
نہیں تقصیر اُس ناآشنا کی
گئے جل حر عشقی سے جگر دل
رہی تھی جان سو برسوں جلا کی

ہم رو رو کے درد دل دیوانہ کہیں گے
جی میں ہے کبھو حال غریبانہ کہیں گے
سودائی و رسوا و شکستہ دل و خستہ
اب لوگ ہمیں عشق میں کیا کیا نہ کہیں گے
ہوں در بدر و خاک بسر چاک گریباں
اس طور سے کیونکہ مجھے رسوا نہ کہیں گے
ویرانے کو مدت کے کوئی کیا کرے تعمیر
اُجڑی ہوئی آبادی کو ویرانہ کہیں گے
موقوف غم میر کہ شب ہو چکی ہمدم
کل رات کو پھر باقی یہ افسانہ کہیں گے

پامال لوگ آگے کیا کیا ہوے ہیں تم سے
اس پر بھی تم جو آئے یاں تم نے سر اٹھائے

ہم کبھو غم سے آہ کرتے تھے
آسماں تک سیاہ کرتے تھے

اے خوشا حال اس کا جس کا وے
حال عمداً تباہ کرتے تھے

برسوں رہتے تھے راہ میں اس کی
تب کچھہ اک اس سے راہ کرتے تھے

نیچی آنکھیں ہم اُس کو دیکھا کئے
کبھو اونچی نگاہ کرتے تھے

کیا زمانہ تھا وہ جو گزرا میر
ہمدگر لوگ چاہ کرتے تھے

چرخ پر اپنا مدار، دیکھئے کب تک رہے
ایسی طرح روزگار، دیکھئے کب تک رہے

سہرے کہاں تک پڑیں، آنسوؤں کے چہرے پر
گریہ گلے ہی کا ہار، دیکھئے کب تک رہے

روے سخن سب کا ہے، میری غزل کی طرف
شعر ہے میرا شعار، دیکھئے کب تک رہے

گیسوو رخسار یار، آنکھوں ہی میں پھرتے ہیں
میر یہ لیل و نہار، دیکھئے کب تک رہے

بہت نا مہرباں رہتا ہے یعنی
ہمارے حال پر کچھہ مہرباں ہے

ہمیں جس جاے کل غش آگیا تھا
وہیں شاید کہ اُس کا آستاں ہے

ستم کے ہونا جور و جفا ہی کرنا
انصاف سے نہ کہنا یہ رسم ہے کہاں کی

ہے سبزۂ لب جو اس لطف سے چمن میں
جوں بھیگتی مسیں ہوں کوئی سرو نوجواں کی

ہیں گھر جہاں میں اپنے لڑکوں کے سے بنائے
جب چاہا تب مٹایا بنیاد کیا جہاں کی

جب سامنے گئے ہم ہم نے اسے دعا دی
شکل اُن نے دیکھتے ہی غصہ کیا زباں کی

ہیگی طلب شرط یاں، کچھ تو کیا چاہئے
بیٹھے نہیں بنتی میاں، کچھ تو کیا چاہئے

عشق میں اے ہمرہاں، کچھ تو کیا چاہئے
گریہ و شور و فغاں، کچھ تو کیا چاہئے

ہاتھ رکھے ہاتھ پر، بیٹھے ہو کیا بے خبر
چلنے کو ہے کارواں، کچھ تو کیا چاہئے

میں جو کہا تنگ ہوں، مار مروں کیا کروں
وہ بھی لگا کہنے ہاں، کچھ تو کیا چاہئے

کیا کروں دل خوں کروں، شعر ہی موزوں کروں
چلتی ہے اب تک زباں، کچھ تو کیا چاہئے

ہو نہ سکے گر نماز، دل کی طرف کر نیاز
وقت گیا پھر کہاں، کچھ تو کیا چاہئے

چاہوں کسو سے دعا، دل کی کروں اب دوا
نفع ہو پھر یا زیاں، کچھ تو کیا چاہئے

یہ تو نہیں دوستی، ہم سے جو تم کو رہی
پاس دل دوستاں، کچھ تو کیا چاہئے

میر نہیں پیر تم، کاہلی اللہ رے
نام خدا ہو جواں، کچھ تو کیا چاہئے

کرو تامل کہ حال ہم میں رہا نہیں ہے غموں کے مارے
جو کچھہ بھروسا جنہوں پہ تھا سو شکیب و تاب و تواں سدھارے
ہوے ہیں غائر قیامت اب تو گئے جگر تک گئے ہیں دل تک
جو تک بھی دیکھے وہ غور سے تو جراحت اس کو دکھا دیں سارے
ہماری آنکھیں بہی ہیں اتنی کہ اب ہے دریا محیط عالم
کہیں کہیں جو رہے ہیں مردم سو بیٹھے ہیں وے کئے کنارے
کریں تامل سو کاہے پر ہم مدام بے خود ہمیشہ غش ہے
گئی ہے طاقت دلوں سے شاید نہیں ہے آیا جگر ہمارے
کبہو سروں پر ہے تیغ نالہ کبہو سنان فغاں جگر پر
کسو سے کہنے کا کچھہ بھی حاصل گئے ہیں جوں توں کے وقت بارے
بھری تھی آتش کہاں کی یا رب دل و جگر میں کہ نصف شب کو
لگا جو رونے تو جاے آنسو مری مژہ سے گرے شرارے
قبول عشق و محبت اتنا ہوا ہے اے میر سیر قابل
مدام جاتے دکھائی دیں ہوں کبہو نہ اُن نے کہا کہ آرے

لالہ کنار دریا نکلا ہے کیا زمیں سے
اُتھتی نہیں ہیں آنکھیں دیکھو اُدھر کہیں سے
بالیدگی سے پہنچے گل آدمی کے سر تک
ہو واں تو رنگ ٹپکے جیب اور آستیں سے
خوش رنگ تر ہے ہر گل رخسار سے پری کے
صد برگ واں طرف ہے خورشید کی جبیں سے
صندل بھری جبیں سے کیا صبح چہرہ ہووے
اس قطعۂ چمن کے محبوب خوش نشیں سے
جب میر جان دینا بوسے کے بدلے ٹھہرا
تب خوف کیجئے کیا پیشانیوں کی چیں سے

---:o:---

فردیات

دل گیا رسوا ہوے آخر کو سودا ہوگیا
اس دوروزہ زیست میں ہم پر بھی کیا کیا ہوگیا

آنے کے وقت تم تو کہیں کے کہیں رہے
اب آے تم تو فائدہ ہم ہی نہیں رہے

اُن نے دیکھا جو اُٹھکے سوتے سے
اُڑ گئے آئینے کے توتے سے

بس نہ لگ چل نسیم مجھہ سے کہ میں
رہ گیا ہوں چراغ سا بجھکر

مشہور ہیں عالم میں تو کیا ہیں بھی کہیں ہم
القصہ نہ در پے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

---:o:---

رباعیات

دامن عزلت کا اب لیا ہے میں نے
دل مرگ سے آشنا کیا ہے میں نے
تھا چشمۂ آب زندگانی نزدیک
پر خاک سے اس کو بھر دیا ہے میں نے

اُترا تھا غریبانہ کنارے آکر
لب خشک موا سو نورچشم حیدر
تر حلق دم آب سے اُس کا نہ ہوا
اے آب فرات خاک تیرے سر پر

بتخانے سے دل اپنے اُٹھائے نہ گئے
کعبے کی طرف مزاج لائے نہ گئے
طور مسجد کو برہمن کیا جانے
یاں مدت عمر میں ہم آے نہ گئے

چپکا چپکا پھرا نہ کر تو غم سے
کیا حرف و سخن عیب ہے کچھ محرم سے
آخر کو رکے رہتے جنوں ہوتا ہے
اے میر کوئی بات کیا کر ہم سے

ہر لحظہ رلاتا ہے کڑھاتا ہے مجھے
ہر آن ستاتا ہے کھپاتا ہے مجھے
کل میں جو کہا رنج سے حاصل میرے
بولا ترا آزار خوش آتا ہے مجھے

دل جنکے بجا ہیں اُن کو آتی ہے خواب
آرام خوش آتا ہے سہاتی ہے خواب
میں غمزدہ کیا اپنے دنوں کو رووں
میری تو جہاں شب ہوئی جاتی ہے خواب

ہم میر سے کہتے ہیں نہ تو رویا کر
ہنس کھیل کے ٹک چین سے بھی سویا کر
پایا نہیں جانے کا وہ در نایاب
کڑھ کڑھ کے عبث جان کو مت کھویا کر

ہرچند کہ طاعت میں ہوا ہے تو پیر
پر بات میری سن کہ نہیں ہے تاثیر

تسبیح بکف پھرنے سے کیا کام چلے
منکے کی طرح دل نہ پھرے جبتک میر

کیا میر تجھے جان ہوئی تھی بھاری
جو اُس بت سنگدل سے کی تھی یاری
بیمار بھلا کیا کوئی ہووے اُس کا
پرھیز کرے جس سے خدائی ساری

حیرت ہے کہ ہو رقیب محرم تیرا
ھمراز و انیس وقت و ھدم تیرا
جوں عکس ترے سامنے اکثر وہ ہو
جوں آئینہ منہ تکا کریں ہم تیرا

کچھہ خواب سی ہے میر یہ صحبت داری
اُٹھہ جائینگے یہ بیٹھے ہوے یکباری
کیا آنکھوں کو کھولا ہے ٹک گوش کو کھول
افسانہ ہے پل مارتے مجلس ساری

دل خوں ہوا ضبط ھی کرتے کرتے
ہم ہو ھی چکے دکھوں کے بھرتے بھرتے
اے مایۂ زندگی ستم ہے یہ اگر
پھر آنکھہ تجھے دیکھیں نہ مرتے مرتے

کیا کیا اے عاشقی ستایا تونے
کیسا کیسا ھمیں کھپایا تونے
اول کے سلوک میں کھیں کا نہ رکھا
آخر کو ٹھکانے ھی لگایا تونے

ملیے اُس شخص سے جو آدم ہووے
ناز اُس کو کمال پر بہت کم ہووے
ہو گرم سخن تو گرد آوے یک خلق
خاموش رہے تو ایک عالم ہووے

ہر صبح غموں میں شام کی ہے ہم نے
خونبابہ کشی مدام کی ہے ہم نے
یہ مہلت کم کہ جس کو کہتے ہیں عمر
مر مر کے غرض تمام کی ہے ہم نے

ہیں گو کہ سبھی تمہاری پیاری باتیں
پر جی سے نہ جائینگی تمہاری باتیں
آنکھیں ہیں ادھر روئے سخن اور طرف
یاروں کی نظر میں ہیں یہ ساری باتیں

ایسا نہ ہوا کہ ہم نے شادی کی ہو
یا سیر بہار باغ ووادی کی ہو
پژمردہ کلی کے رنگ اس گلشن میں
غالب ہے یہی کہ نامرادی کی ہو

محشر میں اگر یہ آتشیں دم ہوگا
ہنگامہ سب اک لپٹ میں برہم ہوگا
تکلیف بہشت کاش مجھکو نہ کریں
ورنہ وہ باغ بھی جہنم ہوگا

ہر صبح مرے سر پہ قیامت گزری
ہرشام نئی ایک مصیبت گزری

پامال کدورت هی رها یاں دن رات
یوں خاک میں ملتے همکو مدت گزری

آئی نه کبهو رسم تلطف تم کو
کرتے نه سدا هم په تاسف تم کو
مرتے هیں اور منه چهپاتے هو تم
هم سے اب تک بهی هے تکلف تم کو

هجراں میں کیا سب نے کنارا آخر
اسباب کیا جینے کا سارا آخر
نے تاب رهی نه صبر و یارا آخر
آخر کو هوا کام همارا آخر

زانو په قدم خم شده سر کو لایا
جائے دنداں کو هم نے خالی پایا
آنکهوں کی بصارت میں تفاوت آیا
پیری نے عجب سماں همیں دکهلایا

وه عهد گیا که جور اُس کے سهئے
وه بات نهیں رهی که چپکے رهئے
جب جی هی چلا تو صرفه کیا هے
بے صرفه جو کچهه که منه میں آئے کهئے

مسجد میں تو شیخ کو خروشاں دیکها
میخانے میں جوش بادہ نوشاں دیکها
اک گوشهٔ عافیت جهاں میں هم نے
دیکها تو محلهٔ خموشاں دیکها

جس وقت شروع یہ حکایت ہوگی
رنجیدہ گی یک دگر نہایت ہوگی
احوال وفا کا اپنی ہرگز مجھہ سے
مت پوچھہ کہ کہنے میں شکایت ہوگی

کاہے کو کوئی خراب خواری ہوتا
کاہے کو ہمیں یہ جاں بھاری ہوتا
دلخواہ ملاپ ہوتا تو تو ملتے
اے کاشکے عشق اختیاری ہوتا

یک مرتبہ دل پہ اضطرابی آئی
یعنے کہ اجل مری شتابی آئی
بکھرا جاتا ہے ناتوانی سے جی
عاشق نہ ہوے کہ اک خرابی آئی

پھر عشق میں میر پاؤں دھرتا ہے گا
جی اور منغض اپنا کرتا ہے گا
سب مل کے بلا سے سمجھا آویں
افسوس کہ وہ جواں مرتا ہے گا

چپکے رہنا نہ میر دل میں تھانو
بولو چالو کہا ہمارا مانو
اک حرف نہ کہہ سکوگے وقت رفتن
چلنے کو زبان کے غنیمت جانو

کی حسن نے تجھہ سے بے وفائی آخر
خوبی نہ رہی نہ میرزائی آخر

رونق نہ رہی غبار خط سے منہ پر
اس سبز قدم نے خاک اُڑائی آخر

یاروں کو کدورتیں ہیں اب تو ہم سے
جس روز کہ ہم جائینگے اس عالم سے
اس روز کھلیگی صاف سب پر یہ بات
اس بزم کی رونق تھی ہمارے دم سے

تیرا اے دل یہ غم فرو بھی ہوگا
اندیشۂ رزق کم کبھو بھی ہوگا
کھانے کو دیا ہے آج حق نے تجھہ کو
کل بھی دیوے گا کل جو تو بھی ہوگا

رنجش کی کوئی اس کی روایت نہ سنی
بے صرفہ کسو وقت حکایت نہ سنی
تھا میر عجب فقیر صابر شاکر
ہم نے اس سے کبھو شکایت نہ سنی

—:0:—

مستزاد

دلی میں بہت سخت دی اب کے گزراں   دل کو کر سنگ
غیرت نہ رہی عاقبت کار نہ شاں   کھینچا یہ ننگ
یاروں میں نہ تھا کوئی مروت جو کرے   اجڑے تھے گھر
تا مد نظر صاف پڑے تھے میداں   عرصہ تھا تنگ

تا چند غم دل سے حکایت کرئیے   ہو ہو کر تنگ
کس کس سے شب و روز شکایت کرئیے   آتا ہے ننگ

سختی کوئی اے صنم کہانتک کھینچئے ھے جی میں کہ اب
ہو نالہ تیرے دل میں سرایت کرئیے پر تو ھے سنگ

———:o:———

مخمسات

در شہر کاما گفتہ شدہ

قابل ھے میری سیر کے اطوار روزگار
چالیں عجب طرح کی چای ھیں عجب شعار
کرتا ھے بدسلوکی سبھوں سے یہ بے مدار
لاتا ھے روز فتنۂ تازہ بروئے کار
دل داغ داغ رھتے ھیں اس سے جگر فگار

کاما سے تلخ کام اُٹھایا مرے تئیں
دلی میں بیدلانہ پھرایا مرے تئیں
ھم چشموں کی نظر سے گرایا مرے تئیں
حاصل کہ پیس سرمہ بنایا مرے تئیں
میں مشت خاک مجھہ سے اسے اسقدر غبار

لشکر میں مجھہ کو شہر سے لایا پئے تلاش
یاں آگے گزری میری عجب طور سے معاش
پانی کسو سے مانگ پیا میں کسو سے آش
اس واقعے سے آگے اجل پہنچی ھوتی کاش
نا موس رھتی فقر کی، جاتا باعتبار

مدت رھا تھا ساتھہ جنھوں کے خراب حال
دانستہ ان سبھوں نے کیا مجھہ کو پائمال
آخر کو آیا مجھہ میں انھوں میں نپٹ ملال
یہ زندگی سہل ھوئی جان کی وبال
اس جمع میں کسو کو نہ پایا میں دستیار

جانا جہاں نہ تھا مجھے سو بار واں گیا
ضعف قویٰ سے دست بدیوار واں گیا
محتاج ہو کے ناں کا طلبگار واں گیا
چارہ نہ دیکھا مضطر و ناچار واں گیا
اس جان ناتواں پہ کیا صبر اختیار

در پر ہر اک دنی کے سماجت مری گئی
نالایقوں سے ملنے لیاقت مری گئی
کیا مفت ہائے شان شرافت مری گئی
ایسا پھرایا اُن نے کہ طاقت مری گئی
مشہور شہر اب ہوں سبکسار بے وقار

عرصہ تھا مجھ پہ تنگ اُٹھا ہو کے نیمجاں
پوچھا نہ مجھ کو یک لب ناں سے کنھوں نے یاں
کم پائی پر بھی سیر کیا میں نے سب جہاں
آشفتہ خاطری نے پھرایا کہاں کہاں
برسوں کا راز مجھ سے ہوا آخر آشکار

پرواخت میری ہو نہ سکی اک امیر سے
عقدہ کھلا نہ دل کا دعائے فقیر سے
فتنے ہمیشہ آتے رہے سر پہ تیر سے
ہر چند التجا کی صغیر و کبیر سے
لیکن ہوا نہ رفع مرے دل کا اضطرار

کن نے کی اپنے حال پہ شفقت سے ایک نگاہ
نکلے ہے کس سے طور پر اپنے سخن کی راہ
بولا نہ کوئی ہم سے کہ تم کیوں ہوئے تباہ
اسلوب اپنے جینے کا ہو کس طرح سے آہ
ہم ایک ناتواں وضعیف اور غم ہزار

حاجت مری روا دل پردرد نے نہ کی
تاثیر اشک سرخ ورخ زرد نے نہ کی

تدبیر ایک دم بھی دم سرد نے نہ کی
دلجوئی میری حیف کسی فرد نے نہ کی
طاقت رہی نہ دل میں، گیا جان سے قرار
ہر ترک شوخ چشم کرے مجھہ پہ کب نظر
ہر چند بند باندھے مرے خوں پہ کیا کمر
ہر دامدار قصد کرے یہ کہاں جگر
یہ منہ نہیں کسی کا جو منہ کو کرے ادھر
ہر کوئی جانتا ہے کسی کا ہوں میں شکار
دل سر بسر خراب ہے تعمیر کیا کروں
آشفتگی حال کی تعبیر کیا کروں
خونابہائے چشم کی تقریر کیا کروں
زردئی رنگ چہرہ کی تحریر کیا کروں
آیا جو میں چمن میں خزاں ہوگئی بہار
حالت تو یہ کہ مجھہ کو غموں سے نہیں فراغ
دل سوزش درونی سے جلتا ہے جوں چراغ
سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ
ہے نام مجلسوں میں میرا میر بے دماغ
ازبسکہ بے دماغی نے پایا ہے اشتہار

———:o:———

شہر آشوب

مشکل اپنی ہوئی جو بود و باش
آئے لشکر میں ہم برائے تلاش
آن کے دیکھی یاں کی طرفہ معاش
ہے لب ناں پہ سوجگہ پرخاش
نے دم آب ہے نہ چمچۂ آش
مرنے کے مرتبے میں ہیں احباب
جو شناسا ملا سو بے اسباب

تنگدستی سے سب بحال خراب
جس کے ھے پال تو نہیں ھے طناب
جس کے ھے فرش تو نہیں ھے فراش
زندگانی ھوئی ھے سب پہ وبال
کنجڑے جھینکے ھیں روتے ھیں بقال
پوچھہ مت کچھہ سپاھیوں کا حال
ایک تلوار نیچے ھے یک ڈھال
بادشاہ و وزیر سب قلاش
پیسے والے جو تھے ھوے ھیں فقیر
تن سے ظاھر رگیں ھیں جیسی لکیر
ھیں معذب غرض صغیر و کبیر
مکھیاں سی گریں ھزاروں فقیر
دیکھیں ٹکڑا اگر برابر ماش
شور مطلق نہیں کسو سر میں
زور باقی نہ اسپ و اشتر میں
بھوک کا ذکر اقل و اکثر میں
خانہ جنگی سے امن لشکر میں
نہ کوئی رند ھے نہ کوئی اوباش
لعل خیمہ جو ھے سپہر اساس
پالیں ھیں رنڈیوں کی اس کے پاس
ھے زنا و شراب بے وسواس
رعب کرلیجئے یہیں سے قیاس
قصہ کوتاہ رئیس ھے عیاش
جتنے ھیں یاں امیر بے دستور
پھر بحسن سلوک سب مشہور
پہنچنا ان تلک بہت ھے دور
بات کہنے کا واں کسے مقدور
حاصل ان سے نہ دل کو غیر خراش

چار لچے ہیں مستعد کار
دس تلنگے جو ہوں تو ہے دربار
ہیں وضیع و شریف سارے خوار
لوت سے کچھہ ہے گرمئی بازار
سوھی قند سیاہ ہے یا ماش
در پہ عمدوں کے روز و شب شر و شور
حرف یکسر فریب و رشوت خور
بے لئے دیکھیں نے کسو کی اور
مردہ شو پر وہ سب کفن کے چور
رحمت اللہ بر اولیں نباش
یک بیک گر کسو کی موت آئی
اس کے مردے کی پھر ہے رسوائی
کیوں نہ پہنچے ہے جن کو امرائی
سب وے اولاد حاتم طائی
کون دے کر کفن اُتھاوے لاش
بالضرورت گیا میں جس کے گھر
آدمی کی نہ جنس تھا وہ خر
بات کرنے لگا تو نیچی نظر
بے مروت سفینہ مد نظر
قابل صد ہزار شاش و تراش
ہے جنھیں کچھہ بھی رویت دربار
سو فریبندہ مکری و غدار
کاذب و مفت بر ہے دل آزار
ڈول ان کا ہے یہ کہ کریے خوار
کام ان کا یہ ہے خراش و تراش
جس پہ تھہری ہے آکے سرداری
ان سے ہم کو تھی چشم دلداری

معرفت ان کی بعد صد خواری
فرد دستخط ہوئی جو یک باری
جیسے کھینچے لکیریں کوئی نقاش
اس لکھے کا نہیں ٹھکانا کچھہ
وھم میں بھی نہیں ھے پانا کچھہ
جس پہ دستخط نہ اُن نے جانا کچھہ
بن نہ آیا مجھے بہانا کچھہ
غیر اس کے لے اٹھوں بشاش
واں سے اُٹھہ کر میں پامال میں آیا
سخت تغییر حال میں آیا
بارھا یہ خیال میں آیا
کہ زیاں شہ کے مال میں آیا
واسطے میرے سو مرا ید قماش
بخشدوں جامہ تک جو ھو قدرت
آٹھوں آتے ھیں خرج یک ساعت
دس روپئے دوں گدا کو بے ملت
مقتضی ھوئے کب مری ھمت
صاحبان کرم کے تئیں شاباش
ھو جو اُن لوگوں میں گدا کا گزر
سہم رہ جائیں سب نہ دیکھیں ادھر
دیر کے بعد یہ کہیں ھل کر
شاہ جی لے خدا سبھوں کی خبر
سو بھی یہ بات ھے پس از کنکاش
یاروں کی جود کا بیاں کیا ھے
وھم میں اُن کے بھی جہاں کیا ھے
آشکارا ھے سب نہاں کیا ھے
دیکھتے ھیں کہیں کہ یاں کیا ھے
ایسی صحبت میں ھم نہ ھوتے کاش

بس قلم اب زباں کو اپنی سنبھال
خوشنما کب ھے ایسے قال و مقال

ھے کڈھب چرخ روسیہ کی چال
مصلحت ھے کہ رھئے ھوکر لال

فائدہ کیا جو راز کریئے فاش

——— : O : ———

مثنویات

جھوت

اے جھوت آج شہر میں تیرا ھی دور ھے
شیوہ یہی سبھوں کا یہی سب کا طور ھے

اے جھوت تو شعار ھوا ساری خلق کا
کیا شہ کا کیا وزیر کا کیا اھل دلق کا

اے جھوت تجھہ سے ایک خرابی میں شہر ھے
اے جھوت تو غضب ھے قیامت ھے قہر ھے

اے جھوت رفتہ رفتہ ترا ھوگیا رواج
تیری متاع باب ھے ھر سو میں آج

اے جھوت کیا کہوں کہ بلا زیر سر ھے تو
اے جھوت سچ یہ ھے کہ عجب فتنہ گر ھے تو

اے جھوت کب ھے عرصے میں تجھہ سا حریف اب
تیرے ھی حکم کش ھیں وضیع و شریف اب

اے جھوت تیرے شہر میں ھیں تابعیں سبھی
مرجائے کیوں نہ کوئی وے سچ بولیں نے کبھی

کہنے سے آج اُن کے کوئی دل نہ شاد ھو
فردا کہیں تو اُس سے قیامت مراد ھو

وعدے گھڑی کے پہروں سب آزما چکے
برسوں تک انتظار کیا جی ھی جا چکے

اے جھوٹ رنگ تیرے کرے کوئی کیا بیاں
رکھتا ہے جیسے غنچہ زباں تو نہ زباں
یوسف کہ تھا نبی و صداقت شعار تھا
پھر حسن ظاہری سے وہ باغ و بہار تھا ق
پایان کار تیرے سبب چاک پیرہن
زنداں میں جاکے برسوں رہا چھوڑ کر وطن
اے جھوٹ تو تو ایک دلاویز ہے بلا
آشوب گاہ تجھ سے زمانہ سدا رہا
کس جانکنی سے کوہکنی کوہکن نے کی
تصویر کھود شیریں کے پیش نظر رکھی
نزدیک جب ہوا کہ وہ مطلوب سے ملے
اب صبح و شام غنچۂ مقصود دل کھلے
دلالہ کے تو پردے میں آ کام کر گیا
دو باتوں میں وہ عاشق دلخستہ مرگیا
اے جھوٹ تجھ سے فتنے ہزاروں اُٹھا کیے
ہنگامہ و فساد بھی ہر سو رہا کیے
اے جھوٹ راستی سے نہیں گفتگو کہیں
کہنے کو ہاں کہیں ہیں حقیقت میں ہے نہیں
اے جھوٹ اس طرح میں بہت جی سے جا چکے
وعدے میں آہ لوگوں کے وعدے ہی آ چکے
اے جھوٹ اس زمانے میں کیونکر چلے معاش
ہے تنگ جھوٹ بولنے سے عرصۂ تلاش
سردار جس سے سب متعلق ہے کاروبار
سچ بولنا ہے اُس کے تئیں سخت ننگ و عار
پھر سب مدار کار دروغی و مفتری
صدق و صفا وُ راستی کِے عیب سے بری
مشکل حصول کام ہے یاں حاصل کلام
باتوں ہی باتوں کام ہوا خلق کا تمام

اے جھوٹ دل مرا بھی بہت دردناک ہے
ان کاذبوں سے صبح نمط جیب چاک ہے

—— : o : ——

گھر کا حال

کیا لکھوں میر اپنے گھر کا حال
اس خرابی میں میں ہوا پامال

گھر کہ تاریک و تیرہ زندان ہے
سخت دل تنگ یوسف جاں ہے

کوچۂ موج سے ہے آنگن تنگ
کوتھری کے حباب کے سے ڈھنگ

چاردیواری سو جگہ سے خم
ترتنک ہو تو سوکھتے ہیں ہم

لونی لگ لگ کے جھڑتی ہے ماٹی
آہ کیا عمر بے مزہ کاٹی

کیا تھمے مینہ سقف چھلنی تمام
چھت سے آنکھیں لگی رہے ہیں مدام

اس چکش کا علاج کیا کریئے
راکھہ سے کب تلک گڑھے بھریئے

جا نہیں بیٹھے کو مینہ کے بیچ
ہے چکش سے تمام ایوان کیچ

آنکھیں بھرلا کے یہ کہیں ہیں سب
کیونکہ پردہ رہے گا یارب اب

جھاڑ باندھا ہے مینہ نے دن رات
گھر کی دیواریں ہینگی جیسے پات

باؤ میں کانپتے ہیں جو تھر تھر
اُن پہ ردا رکھے کوئی کیونکر

کیچ لے لے کے بارے چھوپا ہے
چھوپنا کا ہے کا ہے تھوپا ہے

تسکو پھر پر چھتی بھی ہے ھی نہیں
توتا اک بوریا سا ڈالو کہیں

ڈھانکو دیوار یا اُتھا رکھو
یا ھمارے لیے بچھا رکھو

ایک حجرہ جو گھر میں ہے واثق
سو شکستہ تر از دل عاشق

کہیں سوراخ ہے کہیں ہے چاک
کہیں جھڑ جھڑ کے ڈھیر سی ہے خاک

کہیں گھونسوں نے کھود ڈالا ہے
کہیں چوھے نے سر نکالا ہے

کہیں گھر ہے کسو چھچھوندر کا
شور ہر کونے میں ہے مچھر کا

کونے توتے ھیں طاق پھوتے ھیں
پتھر اپنی جگہ سے چھوتے ھیں

انیت چونا کہیں سے گرتا ہے
جی اسی حجرے ھی میں پھرتا ہے

رکھہ کے دیوار ایدھر اودھر سے
لا کے یارب بغاؤں کس گھر سے

چارپائی جب اس میں بچھوائی
پہلے چلپاسہ ھی نظر آئی

* سام ابرص کہ ہے دوائے خراج
ہر جگہ یاں سے ہے نمایاں آج †

پیکر اپنی خدا نے رکھی ہے
ڈانس اک ایک جیسی مکھی ہے

---

* چھپکلی † پھوڑا

آگے اس حجرے کے ہے اک ایوان
وہی اس ننگ خلق کا ہے مکان

کڑی تختے سبھی دھوئیں سے سیا
اس کی چھت کی طرف ہمیشہ نگاہ

کبھو کوئی سنپولیا ہے پھرے
کبھو چھت سے ہزار پاے گرے

کوئی تختہ مکان سے ٹوٹا ہے
کوئی داسہ مکاں سے چھوٹا ہے

دب کے مرنا ہمیشہ مد نظر
گھر کہاں صاف موت ہی کا گھر

مٹی تودہ جو ڈالی چھت پر ہم
تھے جو شہتیر جوں کمان ہیں خم

مضطرب ہو کے جو بچھائی بہت
ہر کڑی نے کڑی اُٹھائی بہت

پھر سے اِس مٹی میں کرختی ہے
تختہ تختہ ہوئی یہ سختی ہے

دیں ہیں آزواڑیں پھر جو حد سے زیاد
چل ستوں سے مکاں دے ہے یاد

اینٹ مٹی کا در کے آگے ڈھیر
گرتی جاتی ہے ہولے ہولے منڈیر

جیتے ہیں جب تلک نہیں پہنچی
ورنہ کیا بس ہے جو یہیں پہنچی

کنگنی دیوار کی نپٹ بے حال
پدڑی کا بوجھ بھی سکے نہ سنبھال

طوطا، مینا تو ایک بابت ہے
پودنا پھدکے تو قیامت ہے

کیوں کہ ساون کٹے گا اب کی بار
تھرتھراوے بھنیڈی سی دیوار

ہو گیا ہے جو اتفاق ایسا
شاق گزرے ہے کیا کہوں کیسا

ہو کے مضطر لگے ہیں کہنے سب
اُڑ بھنبیری کہ ساون آیا اب

تیتری یاں جو کوئی آتی ہے
جان محزوں نکل ہی جاتی ہے

نہیں دیوار کا یہ اچھا ڈھنگ
کہیں کھسکے تو ہے قیامت تنگ

ایک دن ایک کوا آ بیٹھا
بے گماں جیسے ہوا آ بیٹھا

چیل سے لوگ دوڑے کرتے شور
کہ نہ حایط میں کچھ رہا تھا زور

ہو نہ ایسا کہ اپنی چال چلے
دوڑے اُچھلے کہ حال حال چلے

نہیں وہ زاغ چار پانوں پھرا
ایک کالا پہاڑ آن گرا

مٹی اس کی کہیں کہیں بھسکی
جی ڈھا اور چھاتی بھی دھسکی

سان کر خاک لگ گئے دو چار
بارے جلدی درست کی دیوار

اچھے ہوں گے کھنڈر بھی اس گھر سے
رہے ہے یک خرابی گھر در سے

اُکھڑے پکھڑے کواڑ توتی وصید
زلفی زنجیر ایک کہنہ جدید

خاک لوہے کو جیسے کھاوے پاک
چھیڑ لیجے تو پھر نری ہے خاک

بند رکھتا ہوں در جو گھر میں رہوں
قدر کیا گھر کی جب کہ میں ہی نہ ہوں

گھر بھی پھر ایسا جیسا ہے مذکور
ہے خرابے سے شہر میں مشہور
جس سے پوچھو اُسے بتادے شتاب
ساری بستی میں ہے یہی تو خراب

ایک چھپر ہے شہر دلی کا
جیسے روضہ ہو شیخ چلی کا
بانس کی جادیے تھے سر کنڈے
سووے مہنوں میں سب ہوے تھنڈے

گل کے بندھن ہوے ہیں ڈھیلے سب
پاکھے رہنے لگے ہیں گیلے سب
میذہ میں کیوں نہ بھیگیے یکسر
پھوس بھی تو نہیں ہے چھپر پر

مٹی ہوکر گرا ہے سب والا
وہ رہے یاں جو ہووے ڈھب والا
واں یہ ٹپکا تو یاں سرک بیٹھا
یاں جو بھیگا تو واں تنک بیٹھا

حال کس کو ہے اولتی کا یاد
مگری اس جھگڑے میں گئی برباد
کہیں صحنک رکھوں کہیں پیالا
کہیں ہانڈی کے ٹھیکرے لالا

ٹپکے دو چار جا تو بند کروں
پیلنچ کوئی لڑاوں فند کروں
یاں تو جھانکے ہزار ہیں تنہا
کچھہ نہیں ہاے مجھہ سے ہو سکتا

بسکہ بدرنگ پٹکے ہے پانی
کپڑے رہتے ہیں میرے افشانی
کوئی جانے کہ ہولی کھیلا ہوں
کوئی سمجھے ہے یہ کہ خیلا ہوں

مجھہ سے کیا واقعی ہوا چارا
آسماں جو پتھے تو کیا چارا

بان جھینگر تمام چاٹ گئے
بھیگ کر بانس پھاٹ گئے

تفکے جاندار ہیں جو بیش وکم
تن پہ چڑیوں کو جنگ ہے باہم

ایک کھینچے ہے چونچ سے کر زور
ایک مگری پہ کررہی ہے شو

پوچھہ مت زندگانی کیسی ہے
ایسے چھپر کی ایسی تیسی ہے

کیا کہوں جو جفا چکش سے سہی
چار پائی ہمیشہ سر پہ رہی

بوریا پھیل کر بچھا نہ کبھو
کونے ہی میں کھڑا رہا یک سو

ڈیوڑھی کی یہ خوبی در ایسا
چھپر اس چو چلے کا گھر ایسا

جنس اعلیٰ کوئی کھٹولا کھاٹ
پائے پٹی رہے ہیں جنکے پھاٹ

کھٹملوں سے سیاہ ہے سو بھی
چین پڑتا نہیں ہے شب کو بھی

شب بچھونا جو میں بچھاتا ہوں
سرپہ روز سیاہ لاتا ہوں

کیڑا اک ایک پھر مکوڑا ہے
سانجھہ سے کھانے ہی کو دوڑا ہے

ایک چٹکی میں ایک چھنگلی پر
ایک انگوٹھا دکھادے اُنگلی پر

گرچہ بہتوں کو میں مسل مارا
پر مجھے کھٹملوں نے مل مارا

ملتے راتوں کو گھس گئیں پوریں
ناخنوں کی ھیں لال سب کوریں

ھاتھہ تکیے پہ گہ بچھونے پر
کبھو چادر کے کونے کونے پر

سلسلایا جو پائینتی کے اور
وھیں مسلا کر ایڑیوں کا زور

توشک ان رگڑوں ھی میں سب پھاٹی
ایڑیاں یوں رگڑتے ھی کاٹی

جھاڑتے جھاڑتے گیا سب بان
ساری کھاٹوں کی چولیں نکلیں ندان

نہ کھٹولا نہ کھاٹ سونے کو
پائے پٹی لگائے کونے کو

جب نہ تب پنڈے پر لیسے پائے
سیتلا کے سے دانے مرجھائے

سوتے تنہا نہ بان میں کھٹمل
آنکھہ، منھہ، ناک کان، میں کھٹمل

کہیں پھڑکا کہ جیسی تاب گئی
آنکھہ سے تا پگاہ خواب گئی

اک ھتیلی پہ ایک گھائی میں
سیکڑوں ایک چارپائی میں

ھاتھہ کو چین ھو تو کچھہ کہیے
کب تلک یوں ٹٹولتے رھیے

یہ جو بارش ھوئی تو آخر کار
اس میں سی سالہ وہ گری دیوار

آہ کھینچی خرابی کیا کیا نہ
تھے جو ھمسائے وے ھیں ھمخانہ

ایسے ھوتے ھیں گھر میں تو بیٹھے
جیسے رستے میں کوئی ھو بیٹھے

دو طرف سے تھا کتوں کا رستا
کاش جنگل میں جاکے میں بستا

ہو گھڑی دو گھڑی تو دتکاروں
ایک دو کتے ہوں تو میں ماروں

چار جاتے ہیں چار آتے ہیں
چار عف عف سے مغز کھاتے ہیں

کس کہتا پھوں یہ صحبت نغز
کتوں کا سا کہاں سے لاؤں مغز

وہ جو ایواں تھا حجرے کے آگے
اس کے اجزا بکھرنے سب لاگے

کوتھا بوجھل ہوا تھا بیٹھہ گیا
پانی جز میں اُس کے پیٹھہ گیا

کڑی تختہ ہر ایک چھوٹ پڑا
ناگہاں آسمان ٹوٹ پڑا

میں تو حیران کار تھا اپنا
کوئی اس دم نہ یار تھا اپنا

انیٹ پتھر تھے متی تھی یکسر
خاک میں مل گیا تھا گھر کا گھر

چرخ کی کجروی نے پیسا تھا
پر خدا میرا مجھہ سے سیدھا تھا

کتنے اک لوگ اس طرف دھاے
یا ملک آسمان سے آے

متی لے لے گئے وہ ہاتھوں میں
کام نے شکل ؟ پکڑی باتوں میں

صورت اس لڑکے کی نظر آئی
ہم جو مرتے تھے جان سی آئی

آنکھہ کھولی اُدھر اُدھر دیکھا
اس خرابی کو پھر نظر دیکھا

قدرت حق دکھائی دی آکر
یعنی نکلا درست وہ گو ہر

داشت کی کوٹھری میں لا رکھا
گھر کا غم طاق پر اُٹھا رکھا

مومیائی کھلائی کچھہ ہلدی
فرصت اس کو خدا نے دی جلدی

غم ہوا سن کے دوست داروں کو
پھر بندھا یہ خیال یاروں کو

کہ مری بود و باش یاں نہ رھے
گو تصرف میں یہ مکاں نہ رھے

شہر میں جا بہم نہ پہنچی کہیں
چار و ناچار پھر رھا میں وھیں

اب وھی گھر ھے بے سر و سایہ
اور میں ہوں وھی فرو مایہ

دن کو ھے دھوپ رات کو ھے اوس
خواب راحت ھے یاں سے سو سو کوس

قصہ کوتہ دن اپنے کھوتا ہوں
رات کے وقت گھر میں ہوتا ہوں

نہ اثر بام کا نہ کچھہ در کا
گھر ھے کاھے کا نام ھے گھر کا

———:o:———

در ھجو خانۂ خود کہ بسبب شدت باراں خراب شدہ بود

جسم خاکی میں جس طرح جاں ھے
اس طرح خانہ ہم پہ زنداں ھے

ظلمتیں اس کی سب پہ روشن ھیں
زندہ درگور ہم کئی تن ھیں

ہے جو سر کوب اک بڑی دیوار
واں سے جھانکو تو ہے اندھیرا غار

بخت بد دیکھ سارے پر نالے
اس کے معمار نے ادھر ڈھالے

اب جو آیا ہے موسم برسات
دن کو ہے اپنے ہاں اندھیری رات

صحن میں آب نیزہ بالا ہے
کوچۂ موج ہے کہ نالا ہے

سینہ میں گھر کے پانچ چھ چھپر
ہم غریبوں کے ہوتے ہیں سر پر

پر تلک تنکے تھے کچھ ایک نئے
سو وے چڑیوں کے گھونسلوں کو گئے

دل ہے کچھ مکڑیوں کا احساں مند
کہ جنھوں نے کیے ہیں جھانکے بند

بھوس کچھ ہے کہیں سو آتا ہے
بانس کو جھینگروں نے چاٹا ہے

اُڑ گئی گھانس مٹی ہے والا
ہے جو بندھن سو مکڑی کا جالا

اپنے بندھن سے جو کہ چھوٹا ہے
ہم پہ گویا وہ بانس ٹوٹا ہے

کیا کہوں آہ گھر ہے کہنے کو
باندھتا ہوں مچان رہنے کو

بند جھانکوں کو کیجیے تا کے
یاں تو یک آسمان ٹوٹا ہے

ٹھیکی دینے کو جا اُڑے ہیں ہم
سر پہ ٹھٹھر لیے کھڑے ہیں ہم

تتیاں تھیں جو آگے چھپر کے
بہتی پھرتی ہیں صحن میں گھر کے

تا گلے سب کھڑے ہیں پانی میں
خاک ہے ایسی زندگانی میں

اب تو اپنا بھی حال بدتر ہے
سر پہ ٹھٹھری ہے تسپہ چھپر ہے

پانی بہ کر جھکا جو ہے دالان
سر پہ رہتا ہے طرۂ ایوان

چاک اس ڈول سے ہے ہر دیوار
جیسی چھاتی ہو عاشقوں کی فگار

متصل ٹپکے ہے نہ باراں ہے
گریۂ زار سوگواراں ہے

گھر کی صورت جو اور ہوتی ہے
چھت بھی بے اختیار روتی ہے

میدہ یکبارگی جو ٹوٹ پڑا
کڑی تختہ ہر ایک چھوٹ پڑا

داسے پایان کار ٹوٹ بہے
طاقچے بھر رہے تھے پھوٹ بہے

بہ گئے گولے تختے ڈوب گئے
غرض اجزائے سقف خوب گئے

موج خشتی ستون میں پیٹھی
جان غمناک خون میں بیٹھی

لے گیا پیچ و تاب پانی کا
کوٹھڑی تھی حباب پانی کا

یوں ڈھا گھر کہ بار خاطر تھا
آہ کس کا غبار خاطر تھا

اُکھڑی دہلیز سب منڈیر گری
لہری پانی کی جھاڑو دیتی پھری

ساری بنیاد پانی نے کاٹی
اینٹ کے گھر کو کر دیا ماٹی

جھک گئے سب ستون در بیٹھا
وھی چھپر کھڑا ھے گھر بیٹھا

جب اجاڑے پہ آکے چھت ٹھیری
هم سبھوں میں یہ مصلحت ٹھیری

آؤ اب چھوڑ کر یہ گھر نکلیں
کسو ٹٹی پہ بیٹھہ کر نکلیں

دب کے مرنے سے ڈوب مرنا خوب
ھے کنارا یہاں سے کرنا خوب

سنکے هرکا کے جی میں ڈر آیا
خاطروں میں یہ حرف ٹھیرا یا

گٹھڑی کپڑوں کی میں اُٹھائی تھی
سر پہ بھائی کے چار پائی تھی

بوجھہ کپڑوں کا جن نے باندھا تھا
اس کا سارا فگارا کاندھا تھا

ساتھہ کوئی چراغ لے نکلا
کوئی سر پہ چراغ لے نکلا

چھاج کی کر کے کوئی ت چ
مینہ کے مارے کوئی ت چلا

منہ پہ چھلنی کو یک نے رو پا
ایک نے سکی کا ... ھو پا

ایک نے چھینکے حال حال لیے
پائے پٹی گلے میں ڈال لیے

ایک نے بوریا لپیٹ لیا
اور پایا جو کچھہ سمیٹ لیا

اپنا اسباب گھر سے هم لے کر
الگنی سب کے هاتھہ میں دیکر

صف کی صف نکلی اس خرابی سے
تا کہ پہنچیں کہیں شتابی سے

میر جی اس طرح سے آتے ہیں
جیسے کنجر کہیں کو جاتے ہیں
جن نے اُس وقت آنکھہ کو کھولا
ہنس کے بے اختیار وہ بولا
سنکے اس بات کو تر* آے ہم
بارے اک بھائی کے گھر آے ہم
تب سے رہنے کو اب تلک ہیں خراب
نہیں ملتا ہے گھر بقدر حباب
جس میں خوش یک نفس معاش کریں
طور پر اپنے بود و باش کریں

—— : G : ——

جوش عشق

ضبط کروں میں کب تک آہ اب
چل اے خامے بسم اللہ اب
کر تک دل کا راز نہانی
ثبت جریدہ میری زبانی
یعنی میر ایک خستۂ غم تھا
سر تا پا اندوہ والم تھا
آنکھہ لڑی اس کی اک جاگہ
بے خود ہوگئی جان آگہ
صبر نے چاہی دل سے رخصت
تاب نے ڈھونڈی یکدم فرصت
تاب و توان و شکیب و تحمل
رخصت اُس سے ہو گئے بالکل
سینہ فگاری سامنے آئی
بینائی نے طاقت پائی

*فارسی محاورہ تر آمدن کا ترجمہ ہے یعنی شرمندہ ہونا —

کرتے آئے داغ سیاہی
کام جگر کا کرنے تباہی

خون جگر ہو بہنے لاگا
پلکوں ہی پر رہنے لاگا

خواب و خورش کچھہ کام نہ آیا
ایک گھڑی آرام نہ آیا

چاک جگر سے محبت ٹپکی
آنسوں کی جاگہ حسرت ٹپکی

سوز سے چھاتی تابہ گویا
ایک پلک خوننابہ گویا

آہ سے اُس کی مشکل جینا
درد فقط تھا سارا سینا

دل میں تمنا داغ جگر میں
شیوں لب پر یاس نظر میں

نالے شب کو اُس کے سنکر
مر گئے کتنے سر کو دھن کر

آہ و فغاں ہے اُس کے لب پر
روز نئی * ایک آفت شب پر

روے و جبیں پہ خراش ناخن
داغوں سے خوں کے قامت گلبن

زخم سینہ دل تک پہنچا
کوئی نہ اس گھائل تک پہنچا

آبلہ دل کا جب کوئی پھوتا
فوارہ لو ہو کا چھوتا

غم نے تو دل میں کیا ہے چھوڑا
بر میں تھا اک پکا پھوڑا

---

* کلیات میر مطبوعہ مطبع منشی نولکشور کانپور میں یہ مصرع اس طرح لکھا ہے ' ع ' روز نئی اک آفت سب پر —

سونا گیا اک دم وہ بے کل
بخت نہ جاگے اس کے اک پل
کام رہا ناکامی ھی سے
تسکین بے آرامی ھی سے
رخساروں پر خون رواں ہو
دل میں ہو سو منہ پہ عیاں ہو
دشنۂ غم سے سینے کو کوچا
ناخن سے منھہ سارا نوچا
دل آما جگہ غمناکی
اور نفس اک تیر خاکی
نے طاقت نے یارا اُس کو
ضعف دلی نے مارا اُس کو
نالۂ دل میں حزینی اُس کی
خاطر میں غمگینی اُس کی
رنگ اُڑے چہرے کا ہر دم
تھا گویا گُل آخر موسم
دست بدل ہر آن رھے وہ
بے طاقت بے جان رھے وہ
رنگ شکستہ بسکہ فسردہ
کہنے کو زندہ لیکن مردہ
خونباری سے چہرہ گلگوں
حلق بسمل دیدۂ پر خوں
جدول جاری چاک گریباں
گوشۂ دامن وقف مژگاں
دیدۂ تر کے دریا قابل
ساحل خشک لبی کے سائل
ہر دم ہو ہر سمت کو جاری
خونباری سے سیل بہاری

تشنہ لبی اک ماہی پر پیدا
لب چش جس کا ہووے نہ دریا

خاک بسر آشفتہ سری سے
شور قیامت نوحہ گری سے

سر تا پا آشفتہ دماغی
داغ جنوں دے جس کو چراغی

غم سے گرچہ دم بھی کہیں تھا
جامے میں اک تار نہیں تھا

وادی پر جب اپنی آوے
صحرا صحرا خاک اُڑاوے

کلفت دل جب خاک فشاں ہو
اشک کی جاگہ ریگ رواں ہو

گُل اُن نے از بسکہ کھائے
پھولوں کی چھڑیاں ساتھ بنائے

دل کے غبار نے راہ جو پائی
شہر میں گویا آندھی آئی

سر پر اس کے سنگ ہمیشہ
جی پر عرصہ تنگ ہمیشہ

آہ سرد کرے وہ عریاں
بید سا کانپے موئے پریشاں

گرد کی تہ اس کا پیراہن
دامن صحرا جس کا دامن

بار دامن تار گریباں
دامن قرب و جوار گریباں

پامالی میں مثل جادہ
نقش قدم سا خاک افتادہ

دشت تلک گئی آبلہ پائی
دور کھنچی اس کی رسوائی

اُس کے جو پامال ہوے سب
خار بیاباں لال ہوے سب
جن نے دیکھا اُس کو ایک دم
اُن نے کہا یہ بھول کے سب غم
چندے یہ ناشاد رہے گا
پر مدت تک یاد رہے گا
جلنا اُس سے کرے نہ کنارا
جیسے چراغ وقف بچارا
لو ہو تپکے آہ سحر سے
نالہ گتھواں لخت جگر سے
رکھتا سدا تھا وہ دیوانہ
ورد زباں یہ شعر دانا ق
صار فوادی شقاً شقا
حقاً حقا حقا حقا
ہوش و خرد ناشاد گئے سب
دین و دل برباد گئے سب
درد دل سے کچھ نہ کہے وہ
ہر اک کا منھہ دیکھہ رہے وہ
حسرت اس کی ایک اعجوبا
آب دھن کی موج میں ڈوبا
غیر سے بولے نہ یاروں ہی سے
بات کہے تو اشاروں ہی سے
سمجھو تو کوئی داد کو پہنچو
عاشق کی فریاد کو پہنچو
ورنہ رہے من مار کر اپنا
سر دے مارے ہار کر اپنا
کیونکر غم سے ہو آزادی
جان کے ساتھہ اُس کی ناشادی

کوئی نہ اُس پر سایہ گستر
اپنا ہاتھہ اپنے ہی سر پر
نے کعبہ نے دیر کے قابل
مذہب اُس کا سیر کے قابل
کیسا کہیے کیسا کچھہ تھا
القصہ وہ ایسا کچھہ تھا

——:o:——

دنیا

سنو اے عزیزان ذی ہوش وعقل
کہ اس کارواں گہ سے کرنا ہے نقل
پیمبر ہے شہ ہے کہ درویش ہے
سبھوں کو یہی راہ درپیش ہے
کہو گے کہ آگے تھا کہتا کوئی
نہیں اس سرا بیچ رہتا کوئی
بجا نہی کیا کوس رحلت مدام
کنھوں نے نہ بجتا سنا یاں مقام
یہ بیٹھے جو ہیں سامنے ہیں کہاں
جہاں جملہ ہے ایک بزم رواں
جسے دیکھو چلنے کا گرم تلاش
یہ منزل نہیں جائے بود اور باش
گدا ہو کہ ہو شاہ عالی تبار
تہ خاک سب کا ہے دارالقرار
زہ یک بوئے خوش ہی ہوا ہوگئی
وہ رنگینی باغ کیا ہوگئی
ملے خاک میں جھڑ کے گلہائے تر
پریشان ہوئے مرغ گلشن کے پر

پتنگوں نے گو خاک مسکن کیا
چراغوں نے بھی خانہ روشن کیا

گئی خاک دامن فشانی کے ساتھہ
رہا آب سو بھی روانی کے ساتھہ

رہی راکھہ ہو کر اگر آگ تھی
رکن ہے جہاں باؤ کی لاگ تھی

نہ جدول رہے گی نہ سرو رواں
گلستاں کو پاوینگے ہو کا مکاں

زمیں کا رہے گا یہی کیا سبھاؤ
لپٹ جایئنگے آسماں جیسے تاؤ

سکوں یاں کا دیکھا سراسر شتاب
چلے جاتے ہیں کوہ جیسے سحاب

جہاں ایک ماتم سرا ہے عجب
نہیں جاے باش اور جا ہے عجب

بھلا جی کے جانے کا کیا ہے بیان
عیاں ہے کہ کہتے ہیں جاں کوروان

جوانی گئی موسم شیب ہے
شہود ایک دو روز کو غیب ہے

ہنسوں کیونکہ ہستی میں دنداں نما
کہ ہے جائے دنداں ہی دنداں نما

گیا شور سر سے جھکائے بہت
گئی واشد اب دل رکا ہے بہت

نہ وہ ذایقہ ہے نہ وہ ہے مشام
مزا کچھہ نہیں ہو چکی صبح شام

بلا ارتعاش تن زار ہے
ہر ایک عضو چلنے کو تیار ہے

ہوا حافظہ بسکہ نسیاں کا صرف
نہیں یاد آتا ہے دوشینہ حرف

ہوئے شعر کیا کیا فراموش ہائے
کہوں کیا گزرتی ہے خاموش ہائے

نہ پوچھو لب ولہجہ بے طور ہے
سخن کرنے کا ڈھنگ ہی اور ہے

نہیں گور کے کام سے کچھ فراغ
کسے ذوق صحبت کہاں ہے دماغ

نہ کچھ یوں ہی عینک نظر چڑہ گئی
بصارت کی بے طاقتی بڑہ گئی

نہ رکھیے جو عینک نہ آوے نظر
کہے تو کہ اعمی ہیں ہم بے بصر

رہیں دیکھ جو حرف زن ہو حریف
رہا سننے کی گوں نہ سمع شریف

صد افسوس لطف سماعت نہیں
صدا دور سے جیسے آوے کہیں

شباب آہ داغ جگر دے گیا
قدخم زمیں کی طرف لے گیا

نہ کچھ زور بازو بہت کم ہوا
جھکا سر سوزانو کا ہمدم ہوا

جوانی کی شب کیا بسر ہو گئی
سفیدی مو سے سحر ہو گئی

بدن زار اعضا سبھی رعشہ دار
کرے کون خوباں سے بوس و کنار

جو یہ چال ہے جا رہے ہیں ہم اب
دموں پر غرض آرہے ہیں ہم اب

کھڑے ہوں تو تھرائے ران اور ساق
جییں بیٹھیں کیونکر کہ جینا ہے شاق

جو یوں پاؤں چلتے بچلتے رہے
تو دیکھو گے ہم یاں سے چلتے رہے

اگر ضعف سے چپ ھی رھتے ھیں ھم
یہ سوچو تو کیا کیا نہ کہتے ھیں ھم

کہے ھیں نہیں اپنے تک پاؤ دست
کیا خاک میں مجھہ کو پیری نے پست

جو بازو ھیں اپنے سو بازو نہیں
اگر منہ کو دیکھو تو وہ رو نہیں

بدن کی ھوئی میرے صورت ھی اور
وے آنکھیں نہیں وے نہ چتون کے طور

جسد ناتواں جاے مہمان تلگ
سخن منہ پہ آوے وداعی کے رنگ

لبوں پر نہایت ضعیف ایک آہ
در و بام پر حسرتوں سے نگاہ

شکن جلد میں دل کو پژمردگی
غریزی حرارت میں افسردگی

برودت بہت جسم میں آگئی
مزاجی تھی گرمی سو تھتھرا گئی

چھڑکتا رھوں منہ پہ میں اب کاش
کہ ھوتا رھے روح کا انتعاش

وگرنہ دیا سا بجھا جاے ھے
پھر اُٹھہ بیٹھوں تو جی چلا جاے ھے

سیہ روے شیب اک ستم کر گیا
لکھوں کیا کہ میں جیتے جی مر گیا

قلم رکھہ دے کر میر ختم کلام
تمام اپنی صحبت ھوئی والسلام

———: o :———

مناجات بطور عاشقان زار در بلاے جدائی گرفتار

مرا زخم یا رب نمایاں رهے
پس از مرگ صد سال خنداں رهے
رهے دشمنی جیب سے چاک کو
صبا دوست رکھے مری خاک کو
مژہ اشک خونیں سے سازش کرے
غم دل بهی مجهه پر نوازش کرے
جگر سے تپیدن موافق رهے
مرا درد دل مجهه په عاشق رهے
جو نالہ هو شبگیر کا روشناس
وہ آتهوں پہر هی رهے میرے پاس
مژہ گرم افسوس نمناک هو
که سیلاب آتش په خاشاک هو
کرے نیزہ بازی یه آہ سحر
که خورشید کی پهوٹ جاے سپر
خموشی سے مجهکو رهے گفتگو
اُڑے پر لگا کر مرا رنگ رو
نه مرهم سے افسردہ هو داغ دل
شگفته رهے یه دل باغ دل
سدا چشم حیرت سے نسبت رهے
مجهے دیکهه رهنے کی فرصت رهے
اگر ضعف تک کسب طاقت کرے
مری ناتوانی قیامت کرے
مری بیکسی ناز بردار هو
مروں میں تو مرنے کو تیار هو

بیاباں میں آشفتہ حالی کروں
کہیں تو دل پر کو خالی کروں

کریں در عالم سلامت مجھے
ڈبو دیوے اشک ندامت مجھے

مرا ہاتھہ ہو چک کا دستیار
کہ تا جیب و دامن ہوں قرب و جوار

جنوں میرے سر پر سلامت رہے
بیاباں میں مجھہ سے قیامت رہے

بھکنے سے مجھہ کو نہ ہو وارہی
بھلادے خضر کو مری گمرہی

جو ہو گرم رہ پاے پر آبلہ
تو ہو جاے سرد آتش قافلہ

ارے ساقی اے غیرت آفتاب
کہاں تک ہمیں خون دل کی شراب

کبھو ساغر و بادہ کا دید ہو
محرم ہمارا کبھی عید ہو

—:o:—

در تعریف عشق خانماں آباد و آزادگان برنانہاں

زہے عشق نیرنگ سازی تری
کہ ہے کھیلنا جی یہ بازی تری

تجھی سے ہے یہ اب رخ زرد زرد
تجھی سے مرے دل میں اُٹھتا ہے درد

تجھے ربط کفار و دیندار سے
تجھے رشتہ تسبیح و زنار سے

تجھی سے ہے بلبل کی نوحہ گری
تجھی پر ہے قمری بھی خاکستری

ترا جذب دریا کو بہنے نہ دے
ترا شور صحرا کو رہنے نہ دے

تجھی سے دل شاد غمناک ہے
تجھی سے مرا سینہ صد چاک ہے

تمنا کو تونے کیا ہے شہید
تجھی سے نہ بر آئی میری امید

تجھی سے ہے مجنون صحرا نورد
تجھی سے ہے فرہاد کوہوں پہ مرد

تجھی سے گلوبند ہے خستگی
تجھی سے ہے وابستہ دلبستگی

تجھی سے دل عاشقاں ہے کباب
تجھی سے ہے پروانہ آتش کا باب

ترا کام دینا ہے بدنامیاں
تری رنجشیں دیکھے ہیں ناکامیاں

تجھی سے [illegible] ہیں یار لوگ
تری تیغ سے قیمہ ہیں یار لوگ

تجھی سے ہیں یہ کارپردازیاں
تجھی پر ہیں موقوف جانبازیاں

مجھے اس کے چھپنے کا سودا رہا
ولیکن ترا راز رسوا رہا

لہو اپنا عاشق پیا ہی کیے
ترے جرم پر جی دیا ہی کیے

ترا ہی نمک خوار ہے زخم دل
کہ مرہم سے بیزار ہے زخم دل

تجھے اک ہے مژگاں سے ربط اشک
کہ مشکل ہوا ہے مجھے ضبط اشک

کدھر ھے تو اے ساقی لالہ فام
نہ لغزش ھے تجھہ بن نہ بہکا کلام

کہاں تک کوئی خون دل کو پیئے
کوئی کیونکہ اِس رنگ ظالم جیئے

—:o:—

خواب دل

خوشا حال اس کا جو معدوم ہے
کہ احوال اپنا تو معلوم ہے

رهیں جان غمناک کو کاهشیں
گئیں دل سے نومید سو خواهشیں

زمانے نے رکھا مجھے متصل
پراگندہ روزی پراگندہ دل

گئی کب پریشانی روزگار
رها میں تو هم طالع زلف یار

وطن میں نہ اک صبح میں شام کی
نہ پہنچی خبر مجھکو آرام کی

اُٹھاتے هی سر یہ پڑا اتفاق
کہ دشمن هوے سارے اهل وفاق

جلاتے تھے مجھہ پر جو اپنا دماغ
دکھانے لگے داغ بالاے داغ

جدائی نے آوارہ چاھا مجھے
مری بیکسی نے نباھا مجھے

رفیقوں سے دیکھی بہت کوتہی
غریبی نے اک عمر کی همسری

مجھے یہ زمانہ جدھر لے گیا
غریبانہ چندے بسر لے گیا

بندھا اس طرح آہ بار سفر
کہ نہ زاد رہ کچھ نہ یار سفر
دل اک یار سوے قرار بتاں
غبار سر رہ گزار بتاں
گرفتار رنج و مصیبت رہا
غریب دیار محبت رہا
چلا اکبرآباد سے جس گھڑی
درو بام پر چشم حسرت پڑی
کہ ترک وطن پہلے کیونکر کروں
مگر ہر قدم دل کو پتھر کروں
دل مضطرب اشک حسرت ہوا
جگر رخصتانے میں رخصت ہوا
کھچا سارے رہ دامن چاک دل
رہا بر قفا روے غمناک دل
پس از قطع رہ لاے دلی میں بخت
بہت کھینچے یاں میں نے آزار سخت
جگر جور گردوں سے خوں ہوگیا
مجھے رکتے رکتے جنوں ہوگیا
ہوا خبط سے مجھ کو ربط تمام
لگی رہنے صحبت مجھے صبح و شام
کبھو کف بلب مست رہنے لگا
کبھو سنگ دردست رہنے لگا
کبھو غرق بحر تحیر رہوں
کبھو سر بجیب تفکر رہوں
یہ وہم غلط کاریاں تک کھنچا
کہ کار جنوں آسماں تک کھنچا
نظر رات کو چاند پر گر پڑی
تو گویا کہ بجلی سی دل پر پڑی

مہ چاردہ کار آتش کرے
ڈروں یاں تلک میں کہ جی غش کرے

توہم کا بیٹھا جو نقش درست
لگی ہونے وسواس سے جان سست

نظر آئی اک شکل مہتاب میں
کسی آئی جس سے خور و خواب میں

اگر چند پرتو سے مہ کے ڈروں
ولیکن نظر اُس طرف ہی کروں

ڈروں دیکھ مائل اُسے اس طرف
بعدے کہ آجائیں ہونٹوں پہ کف

پڑی فکر جاں میرے احباب کو
اُڑا دیویں سب گھر کے اسباب کو

کوئی پاس کوئی تفاوت سے ہو
سراسیمہ کوئی محبت سے ہو

کوئی فرط اندوہ سے گریہ ناک
گریباں کسو کا مرے غم سے چاک

جو دیکھوں تو آنکھوں سے لوہو بہے
نہ دیکھوں تو جی پر قیامت رہے

کہے چشم بندی کو ہر بار غیر
ولے منزل دل میں اس مہ کی سیر

وہی جلوہ ہر آن کے ساتھ تھا
تصور مری جان کے ساتھ تھا

اگر ہوش میں ہوں وگر بے خبر
وہ صورت رہے میرے پیش نظر

اُسے دیکھوں جیدھر کروں میں نگہ
وہی ایک صورت ہزاروں جگہ

نگہ گردش چشم سے فتنہ ساز
مژہ آفت روزگار دراز

عجب رنگ پر سطح رخسار کا
مگر تھا وہ آئینہ گلزار کا

جو نکہت اُس کی بینی سے جاکر لڑے
دم تیغ پر راہ چلنی پڑے

مکان کنج لب خواہش جان کا
تبسم سبب کاہش جان کا

دہن دیکھ کر کچھ نہ کہئے کہ آہ
سخن کی نکلتی تھی مشکل سے راہ

سزا ہے جگر اس کسی کے لئے
جو سیب ذقن اس کا بو کر جئے

گل تازہ شرمندہ اس رو سے ہو
خجل مشکناب اُس کے گیسو سے ہو

سراپا میں جس جا نظر کیجیے
وہیں عمر اپنی بسر کیجیے

کہیں مہ کا آئینہ در دست ہے
کہیں بادۂ حسن سے مست ہے

کہیں نقش دیوار دیکھا اُسے
کہیں گرم رفتار دیکھا اُسے

کہیں دلبری اس کو در پیش ہے
کہیں مائل خوبی خویش ہے

کہیں جملہ تن مہر حرف سلوک
کہیں مجھ سے سر گرم حرف سلوک

لطافت سے یکجان ہوے تمیز
سبک سیر مانند عمر عزیز

کہیں جلوہ پرداز وہ عشوہ ساز
کہیں ایستادہ بصد رنگ ناز

ہر اک جائے لے ناز سے وہ سبق
در و بام تصویر کا سا ورق

رہے سامنے اک طرح پر کبھو
رکھے وضع سے پاؤں باہر کبھو

کبھو صورت دل کش اپنی دکھائے
کبھو اپنے بالوں میں منہ کو چھپائے

کبھو گرم کینہ کبھو مہرباں
کبھو دوست نکلے کبھو خصم جاں

کبھو یک بیک یار ہو جائے وہ
کبھو دست بردار ہو جائے وہ

گلے میں مرے ہاتھ ڈالے کبھو
طرح دشمنی کی نکالے کبھو

کبھو چیں برابر و کبھو ہنسکے بات
کبھو بے وفائی کبھو التفات

جو میں ہاتھ ڈالوں تو واں کچھ نہیں
بجز شکل وہمی عیاں کچھ نہیں

ہر اک رات چندے یہ صورت رہی
اسی شکل وہمی سے صحبت رہی

شام صبح ہو گرم وہ سوئے ماہ
کہ در پیش آوے یہ روز سیاہ

کہ جھوما کروں بید مجنوں کی طرز
رہے یاد اُس سرو موزوں کی طرز

رہوں زرد میں گاہ بیمار سا
پریشاں سخن گہ پریدار سا

پری خواں کو لا کوئی افسوں پڑھائے
کسو سے کوئی جا کے تعویذ لائے

طبیبوں کو آخر دکھایا مجھے
نہ پیدا تھا جو کچھ پلایا مجھے

دوا جو لکھی سو خلاف مزاج
کھچا اس خرابی کو کار علاج

کہ سررشتہ تدبیر کا گم ہوا
دل اوپر ہجوم توہم ہوا

دروں خود بخود بے حواسی رہی
پریشاں دلی اور اُداسی رہی

کروں بے کلی جاؤں تا ہر کہیں
نہ گھر میں لگے جی نہ باہر کہیں

قیامت جنوں کا رہے سر میں شور
کھچا جائے دل کو ہو صحرا کی اور

رہے شوق سر در گریبان دل
ہوا کھینچے صحرا کو دامان دل

سر آشفتہ زلف گرہ گیر کا
قدم حلقہ در گوش زنجیر کا

جنوں آہ درپے ہوا جان کے
مجوز ہوئے یار زندان کے

کیا بند اک کوٹھری میں مجھے
کہ آتش جنوں کی مگر واں بجھے

لب نان اک بار دینے لگے
دم آب دشوار دینے لگے

کہاں علم کا کسب فرصت نہ آہ
ہوا کا بھی واں گشت روزن کی راہ

نہ آوے کوئی ڈر سے میرے کنے
کہ کیا جانیے کیسی صحبت بنے

وہ آشفتہ سر ہوشمندی سے دور
نہیں رابطہ مقتضائے شعور

وہ حجرہ جو تھا گور سے تنگ تر
در اُس کا نہ کھلتا تھا دو دو پہر

جو اُس میں کبھو میں سنبھل بیٹھتا
تو باہر بھی اک دم نکل بیٹھتا

سر شام بیٹھا تھا میں ایک روز
افاقت نہ آئی تھی مجھکو ہنوز

کہ یاروں نے بر جستہ تدبیر کی
مرے خون میں کچھ نہ تقصیر کی

اگر چندے کھنے سے خوں کم کیہ
لیا لوھو اتنا کہ بے دم کیا

بڑی دیر تک خون جاری رہا
میں بے ہوش وہ رات ساری رہا

جگایا سحر مجھ کو اک شور سے
کُھلی آنکھ میری بڑے زور سے

وہی دست فصاد میں نیشتر
وہی رنگ صحبت کا پیش نظر

وہی لوھو لینے کا ھنگامہ پھر
وہی تر لہو میں مرا جامہ پھر

لگی نشتر ایسی کہ لگتی نہیں
چبھے جیسے مژگاں کسو کے کہیں

ہوا خون سے دامن و جیب تر
رگ جاں تلک زخم پہونچا مگر

ٹپکتا رہا دیر تک خون ناب
مجھے لے گئی بے خودی کی شراب

سخن ضعف سے سخت دشوار تھا
پلک کا اُتھانا بھی اک بار تھا

کئی روز بالیں پہ یہ سر رہا
خمار ایک مدت تک پھر رہا

کھڑا ہوں اگر پاؤں لغزاں رہے
بدن بید کی طرح لرزاں رہے

چلا جائے سر پاؤں تھر تھر کرے
نسیم سحر کا ر صرصر کرے

جفا ضعف سے مجھ کو کیا کیا نہ تھی
افاقت گئی یوں کہ گویا نہ تھی

پس از چند آنکھیں ٹھہرنے لگیں
نگاہیں بھی کچھ کام کرنے لگیں

بندھا ناتوانی کا رخت سفر
کیا طاقت رفتہ نے منھ ادھر

کسے تھا مری زندگانی کا دھیان
ولیکن نہایت تھا میں سخت جان

لگی جان سی آنے اعضا کے بیچ
کوئی روز رہنا تھا دنیا کے بیچ

پھرا ناتواں میں بہت دور سے
کہ نزدیک تھا عالم گور سے

غلط کاری وہم کچھ کم ہوئی
وہ صحبت جو رہتی تھی برہم ہوئی

وہ صورت کا تھا وہم دیوانگی
لگی کرنے در پردہ بیگانگی

پس از دیر آنکھوں میں آنے لگی
نہ دو دو پہر منھ لگانے لگی

نہ دیکھے مری اور اُس پیار سے
غریبانہ سر مارے دیوار سے

کہیں تک تسلی کہیں بے قرار
کہیں شوق سے میرے بے اختیار

کہیں واسطے میرے روتی ہے خوں
کہیں دست زیر زنخ ہے ستوں

کہیں دل کو اپنے دکھاوے مجھے
مری بے وفائی جتاوے مجھے

کہیں دست بر دل وہ رشک قمر
کہیں حسرت آلودہ مجھ پر نظر

کہیں بے دماغانہ سر گرم ناز
کہیں آتش شوق سے جاں گداز
کہیں چشم گریاں سے داماں چاک
کہیں سو جگہ سے گریبان چاک

کہیں کام دل کی شکایت سے ہے
کہیں نقش دیوار حیرت سے ہے
کہیں مجھ سے کہتی ہے رخصت مجھے
کہ مطلق نہیں غم کی طاقت مجھے

کہیں لب پہ وہ شکوۂ خوں چکاں
کہ ٹپکا کرے جس سے آزار جاں
کہیں وہ نگہ جس سے یہ پائیے
کہ یہ درد دل ہے تو مر جائیے

کہیں وہ روش جس سے نکلے عتاب
کہیں وہ طرح جس سے رہیے خراب
کہیں حرف زن اس طرح ناز سے
کہ دیکھا گیا دل کس انداز سے

کہیں وہ ادا جس سے معلوم ہو
کہ جیسے وہ عاشق کہ محروم ہو
کہیں وہ سخن جو جگر خوں کرے
کہیں طرز ایسی کہ مفتوں کرے

کہیں وضع ایسی کہ بیگانہ ہے
کہیں آشنا ہے تو دیوانہ ہے
کسو جا ہے جلوے میں اس آن سے
کہے تو کہ بیزار ہے جان سے

کسو وقت اس کا یہ اسلوب ہے
کہ شرم محبت سے محجوب ہے
کبھو بے قراری ہے اس رنگ سے
کہ پھرتی ہے سر مارتی سنگ سے

کبھو بے ادائی و دشنام ہے
کبھو بائو کے هاتھ پیغام ہے

کہ اے بے وفا آہ دل نرم کر
محبت کے بھی منہ سے کچھ شرم کر

کبھو وہ تبختر کہ پروا نہیں
کبھو کیوں کہ کہیے کہ سودا نہیں

کبھو یہ سخن جس سے ہو مستفاد
کہ اے بیوفا حرف من یاد باد

کہ ظاهر میں میر اب تو آنا گیا
کہ وہ دوستی کا زمانا گیا

غرض نا اُمیدانہ کر اک نگاہ
وہ نقش توهم گیا سوے ماہ

نہ آیا کبھو پھر نظر اس طرح
نہ دیکھا اُسے جلوہ گر اس طرح

مگر گاہ سایہ سا مہتاب میں
کبھو وهم سا عالم خواب میں

دل خو پذیر وصال دوام
رہے خواب میں روز و شب صبح و شام

اگر وصل خواب فراموش تھا
ولیکن وهی خواب کا جوش تھا

پلک سے پلک آشنا ہے وهی
ز خودرفتگی کی ردا هی وهی

کھڑا هوں تو سوتا هوں اک ذوق میں
رگ خواب دل ہے کف شوق میں

جو بیٹھا هوں خواب گراں ہے مجھے
وہ غفلت جہاں درجہاں ہے مجھے

خیال اس کا آوے کہ من هو رهوں
تلے سر کے پتھر رکھوں سو رهوں

مجھے آپ کو یو نہیں کھوتے گئی
جوانی تمام اپنی سوتے گئی

دکھایا نہ اُس مہ نے رُو خواب میں
نہ دیکھا پھر اُس کو کبھو خواب میں

بہت بے خود و بے خبر ہوچکا
ہم آغوش طالع بہت سوچکا

نہ دیکھا کبھو میر پھر وہ جمال
وہ صحبت تھی گویا کہ خواب وخیال

